# وجودیت اور افسانہ: مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے منتخب افسانوں کا تقابلی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔فل (اردو)


مقالہ نگار:

**ذکاوت سباس عباسی**

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد


جولائی ۲۰۲۱ء

# وجودیت اور افسانہ: مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے منتخب افسانوں کا تقابلی مطالعہ


مقالہ نگار:

**ذکاوت سباس عباسی**


یہ مقالہ

**ایم۔ فل (اردو)**

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان وادب)


**نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد**


جولائی ۲۰۲۱ء

# مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے وہ مجموعی طور پر امتحانی کارگردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: وجودیت اور افسانہ: مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے منتخب افسانوں کا تقابلی مطالعہ

پیش کار: ذکاوت سباس عباسی رجسٹریشن نمبر: 1732M/U/S19

## ماسٹر آف فلاسفی

## شعبہ: اردو زبان وادب

ڈاکٹر نعیم مظہر ____________________

نگران مقالہ

ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان ____________________

پروریکٹر اکیڈمکس

تاریخ __________

# اقرار نامہ

میں، ذکاوت سباس عباسی حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم فل (اردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نعیم مظہر کی نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی آئندہ کروں گی۔

ذکاوت سباس عباسی

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۲۱ء

# فہرست ابواب


مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم ii

اقرار نامہ iii

فہرست ابواب iv

ABSTRACT vii

اظہار تشکر ix

## باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

۱۔ موضوع کا تعارف ۱

۲۔ بیان مسئلہ ۲

۳۔ مقاصد تحقیق ۲

۴۔ تحقیقی سوالات ۲

۵۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق ۳

۶۔ تحدید ۳

۷۔ نظری دائرہ کار ۳

۸۔ تحقیقی طریقہ کار ۴

۹۔ پس منظری مطالعہ ۵

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت ۵

ب۔ وجودیت تعارف و مباحث ۵

۱۔ قنوطی وجودی عناصر ۷

۲۔ رجائی وجودی عناصر ۱۵

ج۔ وجودیت کا مغربی و مشرقی تناظر ۱۸

۱۔ وجودیت کا مغربی تناظر ۱۸

۲۔ وجودیت کا مشرقی تناظر ۲۳

حوالہ جات


## باب دوم: مظہر الاسلام کے منتخب افسانوں کا مطالعہ


الف۔ مظہر الاسلام کے افسانوں میں رجائی وجودی عناصر ۳۴

۱۔ اجتماعی احساس ۳۶

۲۔ صداقت ۴۰

۳۔ آزادی ۴۳

ب۔ مظہر الاسلام کے افسانوں میں قنوطی وجودی عناصر ۴۵

۱۔ خوف ۴۶

۲۔ وحشت / گھٹن ۴۹

۳۔ کرب ۵۴

۴۔ اداسی، تنہائی ۵۶

۵۔ موت ۵۸

حوالہ جات


## باب سوم: احمد جاوید کے منتخب افسانوں کا مطالعہ


الف۔ احمد جاوید کے افسانوں میں رجائی وجودی عناصر ۷۱

۱۔ خود آگہی ۷۱

۲۔ امید ۷۵

۳۔ جوش عمل ۷۷

ب۔ احمد جاوید کے افسانوں میں قنوطی وجودی عناصر ۸۰

۱۔ وحشت / گھٹن ۸۰

۲۔ خوف ۸۳

۳۔ کرب ۸۵
۴۔ لایعنیت ۸۸
۵۔ موت ۹۱
۶۔ سائنسی تشکیک ۹۳
حوالہ جات


## باب چہارم: مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے افسانوں میں اشتراکات وافتراقات


الف۔ اشتراکات ۱۰۴
۱۔ کرب،لایعنیت ۱۰۵
۲۔ تنہائی،اداسی ۱۰۶
۳۔ خوف،وحشت ۱۰۷
۴۔ حریت پسندی ۱۰۹
۵۔ احتجاج ۱۱۳
ب۔ افتراقات ۱۱۵
۱۔ امید ۱۱۶
۲۔ سائنسی تشکیک ۱۱۸
۳۔ داخلیت ۱۱۹
حوالہ جات


## باب پنجم: مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج، سفارشات


الف۔ مجموعی جائزہ ۱۲۶
ب۔ تحقیقی نتائج ۱۳۳
ج۔ سفارشات ۱۳۶
کتابیات ۱۳۷

# ABSTRACT

The title of my research is Existentialism and the Comparative Study of Selected Fictions of Mazhar ul Islam and Ahmad Javed.

The movement of Existentialism in Urdu Literature started since 60 decades. Existentialism is associated with the problems of men. There are two world wars in the prospect of existentialism. Adventure and industrial development are also the causes of existentialism. Urdu fiction also accepted the effects of existentialism. The fictions that are written in the decades of 60 and 70 must include the effects of existential elements.

Mazhur ul Islam and Ahmed Javaid both are also fiction writers of these decades. The existential elements are also found in their fictions. The object of this research is to acknowledge the theoretical views of existence.To inspect the contribution of existential elements in the fictions of both Mazhur Ul Islam and Ahmed Javed.To comparative study of the existential element of both these fiction writers.

The base of this researach is Exsistenlisam; therefore the western and eastern views of exisitence and the opinions of different critics are being discussed. To overview the existential element of selected fiction writers in the perspective of eastern and western existence and the comparision are made based on similarities and dissimilarities in existential elements.

The documentary research methodology has been adopted. For the references of existentialism the critical articles, critical books have been studied. The selected fiction of representative authors has been acquired. The critical essays on the fiction of Ahmed Javed and Mazhur Ul Islam were also included in the research.

My Research consists of five chapters.

The first chapter deals with Existentialism and its perspective.The movement of Western and Eastern Existentialism is being discussed. And the views of various critics have been presented, along with existential elements being divided into two parts, positive and negative aspects of existential elements being discussed.

The Second Chapter is contains two parts. Within first part, I discussed optimistic components from selected short stories of Mazhar ul Islam, under Existentialism. The second part contains an analysis of pessimistic components.

The Third chapter contains two parts. Within first part, I discussed optimistic components from selected short stories of Ahmad Javed, under Existentialism. The second part contains an analysis of pessimistic components.

The fourth chapter contains the comparative study of both fiction writers from their selected short stories under Existentialism. I have also analyzed the similarities and dissimilarities of optimistic and pessimistic Existential components.

Chapter five contains findings and recommendations.

# اظہارِ تشکّر

اس مقالے کی تکمیل کے لیے میں رب کائنات کی حمد و ثناء اور بے حد شکر گزار ہوں جس کی خصوصی کرم نوازی ہے۔ اس مقالے کے لیے میرے نگران ڈاکٹر نعیم مظہر اور نمل کے دیگر اساتذہ کی انتہائی ممنون و مشکور ہوں میں جنہوں نے تحقیق کے ہر مرحلے پر پر میرا ساتھ دیا اور ہر مرحلے پر ان کی شفقت و محبت میرے شامل حال رہی۔

اپنے والدین کی بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اس مقام پر پہنچایا۔ عادل سعید عباسی کا بے حد شکریہ جنہوں نے مجھے ایم فل کرنے کا مشورہ دیا اور ہر مرحلے پر ان کی رہنمائی میرے ساتھ رہی۔ احتشام الحق عباسی کا شکریہ جنہوں نے میرے لیے کتابوں کی فراہمی کو آسان اور سہل بنایا اور اپنے گھر والوں کا بہت شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے اپنے لئے مختص وقت میں سے مجھے یہ مقالہ مکمل کرنے کا موقع دیا۔

آخر میں تمکنت سباس عباسی، مفسر مطلوب عباسی کا شکریہ جنہوں نے تحقیق کے ہر مرحلے میں میری مدد کی۔ علی احسن عباسی کا خصوصی شکریہ جنہوں نے اس مقالے کی بروقت تکمیل میں میری مدد کی اس کے علاوہ دیگر احباب کا شکریہ جن کی وجہ سے میں مقالے کی بروقت تکمیل میں کامیاب ہوئی۔

ذکاوت سباس عباسی

اسکالر ایم فل اردو

# باب اول

## موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

### الف۔ تمہید

### ا۔ موضوع کا تعارف

وجودیت ایک مغربی فلسفیانہ تحریک ہے اس کا آغاز ڈنمارک کے فلسفی کرکیگارڈ کے افکار سے ہوا۔اس تحریک کا آغاز پہلی اور دوسری جنگ عظیم ہے کے بعد ہوا اردو ادب میں آنے والی بیشتر تحریکوں کا تعلق مغرب سے ہے۔اردو ادب میں ۶۰ء کی دہائی میں وجودیت کے اثرات ظہور پذیر ہوئے لیکن مشرق میں وجودیت کی شکل قدر بدلی دیکھنے کو ملتی ہے۔وجودیت بحران زدہ انسان کے مسائل پر بات کرتی ہے یہ فرد کی اندرونی کیفیات کو بیان کرتی ہے۔جنگ عظیم دوم کے بعد جب ہر طرف افراتفری کا عالم تھا لاکھوں لوگ جنگ میں مارے گئے جن کی کوئی شناخت نہ رہی۔انسان،انسان کے درپے تھا ان حالات نے انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس کی تخلیق کا کیا مقصد ہے ؟ جب انسان نے اپنے آپ کی تلاش شروع کی اور اپنے داخل کی طرف رجوع کرنے لگا۔ صنعتی ترقی نے طرح طرح کی مشینیں ایجاد کیں مشینوں نے انسان کی زندگی جہاں سہل کی وہیں کئی لوگوں کے منہ سے نوالہ چھین لیا۔انسان مشینوں کا غلام بن کر رہ گیا معاشرے سے اخلاقی اقدار ختم ہو گی۔فرد تنہا زندگی گزارنے لگا۔ان سب حالات کے پیش نظر کرکیگارڈ نے یہ کہا کہ انسان ان مسائل سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے اگر وہ اپنے داخل کی طرف رجوع کرے۔ وجودیت کے عناصر میں تنہائی مایوسی، اداسی، کرب، لایعنیت، بیگانگی، بے چارگی، وحشت اور موت جیسے عناصر شامل ہیں۔یہی عناصر مشرق میں اردو ادب میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔جب وجودیت نے اردو ادب میں قدم رکھا اس ملک کی سیاسی صورتحال بدترین مسائل کا شکار تھی۔ملک سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی بحران کا شکار ہو چکا تھا اظہارِ بیان پر پابندی تھی۔کمزور طبقہ کا استحصال کیا جا رہا تھا معاشرے میں خوشامد، جھوٹ اور مکر و غریب کا زہر پھیل رہا تھا۔ان مسائل کو حل افسانوی ادب میں علامتی اور استعاراتی انداز میں پیش کیا گیا۔وجودیت کے اثرات مظہر الاسلام اور احمد جاوید

کے افسانوں میں بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس مقالے میں مذکورہ بالا افسانہ نگاروں کے افسانوں کا وجودیت کے تناظر مین جائزہ لیا گیا ہے اور ان میں مشترک اور مخالف عناصر دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔

## ۲۔ بیانِ مسئلہ

ادب معاشرتی مسائل کو ایک خاص نقطہ نظر پر دیکھتا ہے۔ اس سے معاشرتی مسائل کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور اس کی اصلاح کی کئی صورتیں عیاں ہوتی ہیں ان مسائل کو افسانوی ادب میں پیش کیا گیا ہے۔ جدید اردو افسانے کا ایک خاص موضوع وجودیت رہا ہے۔ وجودیت دہشت انگیز فضا، مشینی ترقی، تنہائی اور رشتوں کے بکھر جانے جیسے مسائل کی دین ہے۔ مشرق میں وجودی عناصر بکھری ہوئی صورت میں نظر آتے ہیں اور مشرقی ادب تنقید میں وجودیت کے تنقیدی مباحث ہر نقاد کے ہاں مختلف صورتوں میں ملتے ہیں۔ لٰہذا ضروری ہے مجوزہ موضوع کے ذریعے ان تنقیدی مباحث کی تفہیم کے ساتھ ساتھ عملی طور پر مشرقی افسانوی ادب میں وجودی عناصر کا جائزہ لیا جائے۔

## ۳۔ مقاصدِ تحقیق

مجوزہ مقالے میں درج ذیل تحقیقی مقاصد کے پیش نظر رہے ہیں:

۱۔ جدید اردو افسانے میں وجودیت کے نظری مباحث کو سمجھنا۔

۲۔ مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے افسانوں میں وجودی عناصر (کرب، لایعنیت، مایوسی، اداسی، خوف، دہشت اکتاہٹ موت اور امید) کی پیشکش کا جائزہ لینا۔

۳۔ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں موجود وجودی عناصر کا تقابلی مطالعہ کرنا۔

## ۴۔ تحقیقی سوالات

مجوزہ مقالے میں درج ذیل تحقیقی سوالات پیش نظر رہے ہیں

۱۔ جدید اردو افسانے میں وجودیت کی تفہیم کی روایت کیا ہے؟

۲۔ مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے افسانوں میں وجودی عناصر کی پیشکش کی نوعیت کیا ہے؟

۳۔ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں وجودی عناصر کی پیشکش میں اشتراکات وافتراقات کیا ہیں؟

## ۵۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

مظہر الاسلام اور احمد جاوید نامور افسانہ نگار ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے مختلف مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ مظہر الاسلام کی افسانہ نگاری پر بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں مقالہ لکھا جا چکا ہے۔ احمد جاوید کی افسانہ نگاری کے حوالے سے مختلف مقالہ جات لکھے جا چکے ہیں۔ ان افسانہ نگاروں پر علامتی حوالے سے تحقیقی کام کیا گیا ہے۔ جبکہ میرا موضوع وجودیت کے تناظر میں مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے منتخب افسانوں کا تقابلی مطالعہ ہے جو اپنی نوعیت کا منفرد موضوع ہے اور اس موضوع پر تا حال جامعاتی سطح پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔

## ۶۔ تحدید

وجودیت کے تناظر میں مشرقی افسانے کا جائزہ لینا اور اسے ایک مقالے میں سمیٹنا مشکل امر ہے لہذا اس مقالے کے ذریعے وجودیت کا تعارف اور منتخب نقادوں کی آراء کی وضاحت کی گئ ہے۔ اس کے ساتھ مظہر الاسلام، احمد جاوید کے دس دس افسانوں کو منتخب کیا گیا ہے اور ان افسانوں میں موجود وجودی عناصر کا جائزہ لیا گیا ہے۔

## ۷۔ نظری دائرہ کار

وجودیت ایک مغربی تحریک ہے مغرب میں اس کے علمبردار کرکیگارڈ، مارسل، سارتر، البرٹ کامیو اور فرانز کافکا ہیں۔ ان کے افکار میں اختلاف کے باوجود زندگی کے چند رویوں میں اشتراک بھی ملتا ہے پیشِ نظر تحقیق کے ذریعے مغربی وجوی مفکرین کرکے گارڈ، مارسل، سارتر اور البرٹ کامیو کے نظریات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔ جبکہ مشرق میں جمیل جالبی، حسن عسکری، انیس ناگی، جاوید حسین قاضی، ناصر عباس نیر، ڈاکٹر وحید اختر، اور ممتاز احمد کے وجودیت کے تناظر میں مختلف نظریات پیش نظر رہے ہیں۔ مغرب میں وجودیت کے دو گروہ ہیں ایک گروہ خدا کے وجود کا قائل ہے جبکہ دوسرا گروہ خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے اس کے برعکس مشرق میں وجودی عناصر منتشر نظر آتے ہیں اور ان کی پیشکش میں بھی اختلاف نظر آتا ہے۔ مجوزہ تحقیق موضوع کے ذریعے دو مشرقی ہم عصر افسانہ نگار مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے افسانوں کا وجودیت کے تناظر

میں تقابل کروایا گیا ہے ۔جس میں ان دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں موجودوجودی عناصر کا اشتراک اور اختلاف کی بنیاد پر جائزہ لیا گیاہے مندرجہ ذیل نکات مجوزہ تحقیق میں پیش رہے ہیں

۱۔انفرادیت

۲۔انتخاب کی آزادی

۳۔مایوسی،اداسی،بیگانگی

۴۔کرب،لایعنیت،موت

۵۔بغاوت،امید

۶۔منافقت،خودغرضی،خوشامد

۷۔تنہائی،خوف،وحشت

۸۔خودآگہی،خودشناسی

۹۔امید

۱۰۔اجتماعی احساس

۱۱۔صداقت

۱۲۔حریت پسندی

مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے افسانوں کے متن کا جائزہ لیا جائے گا اور وجودی عناصر کی پیشکش کے پس پردہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی محرکات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بنیادی ماخذ کے طور پر مظہر الاسلام کے افسانوی مجموعے گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی،خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر اور احمد جاوید کے افسانوی مجموعوں میں غیر علامتی کہانی، چڑیا گھر، گمشدہ شہر کی داستان سے افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔

## ۸۔ تحقیقی طریقہ کار

دستاویزی تحقیقی طریقہ کار اختیار کیا گیاہے ۔وجودیت کے حوالے سے تنقیدی مضامین، تنقیدی کتب اور ادبی اصطلاحات کو مدنظر رہی ہیں۔ منتخب شدہ افسانہ نگاروں کی نمائندہ تصانیف تک رسائی حاصل کی گئی ہے۔احمد جاوید کی افسانہ نگاری پر تحریر کردہ تنقیدی مضامین و آراء بھی شامل تحقیق رہے ہیں۔ تنقیدی مضامین اور

کتب تک رسائی کے لیے مختلف کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے اس ضمن میں اردو کے نمائندہ ادبی رسائل وجرائد سے بھی مواد لیا گیا ہے۔

## ۹۔ پس منظری مطالعہ

پس منظری مطالعہ کے طور پر وجودیت کے حوالے سے اردو میں شائع ہونے والی کتب، تراجم، مختلف ناقدین کی آراء اور ادبی رسائل میں شائع ہونے والی تحقیق وتنقیدی مضامین پیش نظر رہے ہیں۔وجودیت پر ایک تنقیدی نظر سلطان علی شیدا، وجودیت اور انسان دوستی مترجم قاضی جاوید، فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ ازڈاکٹر جمیل اختر محبی اس کے علاوہ مظہر الاسلام اور احمد جاوید کی افسانہ نگاری کے حوالے سے لکھے گئے تحقیقی مقالات بھی مد نظر رہے ہیں۔

## ۱۰۔ تحقیق کی اہمیت

اس مقالے کے لیے مشرق میں وجودیت کے تنقیدی مباحث کی تفہیم کی گئی ہے اور عملی طور پر مشرق میں وجودی عناصر کی پیشکش کی نوعیت کو سامنے لایا گیا ہے جو کہ اردو ادب میں وجودیت کی تفہیم اور جدید اردو افسانے میں وجودیت کے عناصر کو کی پیشکش کو سمجھنے میں مدد گار ثابت ہو گا۔

## ب۔وجودیت تعارف ومباحث

لفظ وجودیت عربی زبان کے لفظ وجود سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں بدن، جسم، زندگی۔وجودی مفکرین کے ہاں بھی لفظ وجودیت انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔وجودیت ک ے اصطلاحی معنی "Dictionary of literary terms and theories" میں یوں بیان کیے گئے ہیں

> "The term existentialism means pertaining to exist or logic
> predicating existence philosophically, it now applies to a
> a vision of the condition and existence of a men and his
> place and foundation in the world and his relationship ,

or leak of one ,with God." [1]

وجود کی اصطلاح سب سے پہلے مغرب میں استعمال ہوئی اور رفتہ رفتہ اس نے ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی۔ وجودیت کی کوئی حتمی تعریف کرنا مشکل ہے کیونکہ یہ مختلف مفکرین کے ہاں مختلف ہے۔ بنیادی طور پر مفکرین نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ اس دنیا میں انسان کے وجود کی کیا اہمیت ہے؟ کیا وہ اس دنیا میں میں اپنی مرضی سے زندگی گزار سکتا ہے؟ اگر نہیں تو وہ بنیادی وجوہات کیا ہیں جو انسان کو اپنی مرضی سے زندگی گزارنے نہیں دیتی اور انسان ان اقدار اور روایات کا پابند ہوتا ہے۔ تمام وجودی فلسفی اس بات پر متفق ہیں کہ فرد کی انفرادی حیثیت زیادہ اہمیت کے حامل ہے فرد جماعت میں رہ کر اپنی انفرادیت کھو دیتا ہے۔ وجودی مفکریں فرد کو انفرادی زندگی کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ سارتر نے "Existentialism and Humanisam" میں وجودیت ک تعریف اس طرح کی ہے

"In any case'we can begin by saying that existentialism in our sense of the word is a doctrine that does render human life possible a doctrine also which affirms that every action imply both an environment and a human subjectivity." [2]

وجودیت فرد کی انفرادی زندگی یا وجود کے متعلق مسائل سے وابستہ ہے۔ وجودیت ایک فرد کی تنہائی،، مایوسی، اداسی اور گھٹن جیسے مسائل کو سامنے لاتی ہے۔ ان تمام مسائل کے پس منظر میں جائیں تو ہمیں تین بڑے عوامل نظر آتے ہیں جو اس تحریک کا باعث بنے ان میں انقلاب فرانس، دوسری جنگ عظیم اور سائنسی ترقی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس تحریک نے زیادہ زور پکڑا۔ انسان نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی جانیں جاتی دیکھی۔ ہر طرف گہما گہمی کا عالم تھا اور اپنوں کو آنکھوں کے سامنے جدا ہوتے دیکھا ان حالات میں فرد میں اپنی شناخت کا مسئلہ پیدا ہوا۔ جنگ میں ہزاروں لوگوں کی جانے چلی گئیں جن کی کوئی شناخت نہ تھی ایسے میں انسان مایوسی، اداسی اور گھٹن کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا اور وجود کے مسائل سامنے

آئے۔ صنعتی ترقی نے دنیا میں اس قدر گہما گہمی پھیلادی کہ آدمی اپنوں سے دور ہونے لگااور مشینوں کا غلام بن گیا۔ڈاکٹر سی۔اے قادر نے اس حوالے سے لکھا ہے

"یہ وہ وقت تھا جب ہر طرف فردکی فردیت پر حملے ہورہے تھے۔ انسان کو معروض بنادیا گیااور جبریت کا دورہ تھامادیت اور مطلق تصوریت نے انسان کا دائرہ تنگ کرر کھا تھااوراسے مقہوراور مجبور زندگی دے رکھی تھی"۔(۳)

انسان کوجب اس دنیا میں اپنی حقیقت ایک ننھے قطرے کی جیسی معلوم ہوئی تو اس نے اپنی انفرادیت کی طرف توجہ کی کہ آخر اس دنیا میں میرا کیا مقام ہے؟ سائنسی ترقی نے جہاں دنیا کو ترقی یافتہ بنایاوہاں ہی انسان کے لیےلاکھوں مسائل بھی لا کھڑا کر دیے۔ بم ایجاد تو کر لیالیکن اس کا استعمال انسانی جانوں کو ہی ختم کرنے کے لئے کیا گیا۔انسان ،انسان کا دشمن بن گیاان حالات کے پیش نظر انسان کو داخلی زندگی ہی ایسی جگہ ملی جہاں اس نے پناہ لی یہ وہ عوامل تھے جن کے باعث وجود کے مسائل سامنے آئے اور وجودیت نے جنم لیا۔ڈاکٹر نعیم احمد کے مطابق:"وجودیت کے دورخ ہیں؛ایک الٰہیاتی وجودیت اور دوسرا غیر الٰہیاتی وجودیت جسے دہریت کانام بھی دیاجاتاہے"(۴)۔ وجودی عناصر سے مراد وجود کے وہ مسائل ہیں جو فرد کی شناخت کا باعث بنے اور وجودی مفکرین کی بحث کا حصہ رہے ہیں۔وجودی مفکریں نے ان تمام عوامل کو زیر بحث لایاہے جو کہ ایک فرد کی انفرادی زندگی کے متعلق تھے یا حالات کے پیدا کردہ وہ مسائل تھے جنہوں نے داخلی زندگی کی طرف توجہ دلائی۔

وجودی عناصر کی دواقسام ہیں:۱۔ قنوطی وجودی عناصر ۲۔رجائی وجودی عناصر

## ا۔ قنوطی وجودی عناصر:

قنوطیت سے مرادمایوسی،ناامیدی یامنفی رویہ ہے۔ قنوطی وجودی عناصر سے مراد وہ عناصر ہیں جن کے باعث انسان مایوسی کا شکار ہوا اور اداسی کی طرف مائل ہوا۔دنیا کے حالات نے انسان کو ایسی جگہ کھڑا لایا جہاں اس کے اندر نفرت اور مایوسی جیسے رویے نے جنم لیا۔

درج ذیل وجودیت کے قنوطی عناصر ہیں:

## تنہائی

تنہائی قنوطیت کی اس کیفیت کا نام ہے جب انسان آس و امید کا دامن چھوڑ کر خود کو الگ تھلگ سمجھنے لگتا ہے اسے کسی سے کوئی امید وابستہ رکھنا لا یعنی لگتا ہے وہ صرف اپنی ذات تک محدود رہتا ہے اور اسے یگانہ ہونے کا احساس اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد بنانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ دوسروں سے دوری اختیار کرنے کے درپے ہو جاتا ہے اور اپنی عافیت اپنے وجود سے وابستہ کر لیتا ہے اسے امید کی کوئی کرن ایسی نہیں دکھائی دیتی ہے جو اس کی ڈھارس بندھائے۔ گویا وہ اجتماع کو چھوڑ کر ایک قطرے کی زندگی گزارنے کا عادی ہو جاتا ہے جو شور و شغب سے دور بس وجود واحد ہی اس کی منشا اور منزل ہوتی ہے۔

جنگ عظیم دوم میں جب انسانیت سے اعتبار اُٹھ گیا اور انسان نے اپنا تحفظ کھو دیا تو وہ خود کو اکیلا محسوس کرنے لگا انسان کو اپنے خدا سے بھی بھروسہ اُٹھ گیا۔ کرکیگارڈ جو کہ وجودیت کا علمبردار تھا خود کو ایک تنہا فاختہ سمجھتا تھا۔

> ”پہلی کیفیت جس کا کرکیگارڈ کو احساس ہوتا ہے وہ تنہائی یا اکیلے پن کی ہے۔
> وہ اپنے آپ کو ایسی فاختہ سے تشبیہ دیتا ہے۔ جو ایک خزاں زدہ صنوبر کی
> ٹنڈ منڈ شاخ پر تن تنہا بیٹھی ہوئی ہے“۔(۵)

انسان کو اس دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہ ملی جو اس کے لیے پرسکون ہو یا کوئی ایسی ہستی نہ ملی جو اس کے غم کا کا مداوا کر سکے صرف اس کا وجود تھا جو شک سے بالاتر تھا لہٰذا وجود کو بنیاد بنا کر اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے لگا۔ انسان تنہائی کا شکار تب ہوتا ہے جب وہ خود کو سماج سے الگ تصور کرنے لگتا ہے وہ دوست اور رشتے داروں کی کمی محسوس کرنے لگتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے یہ کیفیت اس کو ذہنی دباؤ میں مبتلا کر دیتی ہے اکیلا پن انسان کو مایوسی اور افسردگی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

## مایوسی، اداسی

مایوسی اور افسردگی کیفیت کا نام ہے جو کسی خاص وجہ سے جنم لیتی ہیں مایوسی اور اداسی زیادہ تر ذی شعور میں پائی جاتی ہے محسوسات جس کی جتنی زیادہ ہیں وہ اس سے اتنا ہی زیادہ متاثر ہو گا ہے۔ جو شخص جتنا حساس ہو گا اس پر مایوسی بھی اسی نسبت سے اثر انداز ہو گی۔ مایوسی کو نصف موت سمجھا جاتا ہے اس سے قوائے عقلیہ سے لے

کر انسانی وجود تک متاثر ہوتے ہیں۔ انسان ہمت کا دامن چھوڑ دیتا ہے اور سعی کا عنصر مفقود ہو جاتا ہے یہ کیفیت کی مایوسی کی طرف دھکیل دیتی ہے۔انسان نے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھا اور بدلتی ہوئی دنیا میں اپنا مقام کچھ نہ پایا تو خود کو ایک حقیر تنکے کی طرح سمجھنے لگا اور سوچنے لگا عظیم الشان دنیا میں میرا کیا مقام ہے۔جب یہ سوال انسان کے سامنے آیا تو وہ مایوسی کی طرف مائل ہو گیا کیونکہ اس کا جواب کوئی فلسفہ نہیں دے پایا۔

مایوسی ایک تکلیف دہ کیفیت ہے جو انسان کو اپنے وجود سے راہ فرار کی طرف راغب کرتی ہے۔

## خوف

ہر کیفیت کا وجود کسی موجب کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے خوف کی کیفیت کا موجب خطرہ ہوتا ہے خطرات ہر ذی روح کی کیفیت کو تبدیل کر دیتے ہیں اس کے رد عمل کے طور پر وجود میں آنے والی یہ کیفیت انسان ہو یا حیوان اپنے آپ کو بچانے پر مجبور کرتی ہے۔ اس کیفیت میں اپنے آپ کو بھاگ کر یا پھر روپوش ہو کر سکون دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس صورت میں قلق و خلجان بدرجہ پیدا ہوتے ہیں جو بھاگنے، چھپنے یا پھر زندگی کی بازی ہارنے پر مجبور کرتے ہیں۔اولین صورت میں زندگی کو دوام دینے کے لیے روپوش ہو جانا یا ان حالات و کیفیات سے روگردانی کرنا مقصود ہوتا ہے لیکن جب خوف کی کیفیت بام عروج پر آجائے تو پھر زندگی کا چراغ ہی گل کر دیا جاتا ہے۔

وجودی مفکرین خوف سے مراد یہ لیتے ہیں کہ کسی شخص یا کسی چیز کا خوف جو انسان کو نقصان پہنچائے۔ گھما گھمی کے اس دور میں انسان دوسرے انسان سے ہی خوف محسوس کرنے لگا۔ کرکیگارڈ دہشت اور خوف کو یوں بیان کرتا ہے

> ”خوف تو کسی نہ کسی شے یا فرد کا ہوتا ہے لیکن دہشت کسی خاص شے یا شخص
> سے وابستہ نہیں ہوتی بلکہ آزادی عمل کی پیداوار ہے۔“ (۶)

صنعتی ترقی نے جہاں انسان کو سہولیات فراہم کیں وہاں اس کے لئے خطرہ بھی لے کر آئی۔ انسان نے بم تو ایجاد کر لیا لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ اس کے ذریعے انسانوں کی زندگیوں کا ہی خاتمہ کیا جانے لگا۔افراتفری کے اس عالم میں میں انسان کو دوسرے انسان سے خوف محسوس ہونے لگا۔وجودی مفکرین خوف سے مراد یہ لیتے ہیں کہ کسی شخص یا کسی چیز کا خوف جو انسان کو نقصان پہنچائے۔

## وحشت، کرب

وحشت اس کیفیت کا نام ہے جس کے معرض وجود میں آنے کے مختلف النوع عناصر ہوتے ہیں اس میں احساس اور صلہ رحمی کا فقدان ہو جاتا ہے انسان انسانیت کے معیار سے گر کر حیوانیت کی صفات کی طرف چل پڑتا ہے اسے بس دنیاومافیہا اپنی ذات تک ہی محدود نظر آتی ہے دوسروں کا نفع و نقصان یکسر نظر نہیں آتا ہے اپنے پیٹ کے دوزخ کو بھرنے کی خاطر دوسروں کی زیست بھی ہیچ دکھائی دیتی ہے جب وحشت کے اثرات کسی دوسری ذات پر پڑتے ہیں تو اس سے خوف کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے ۔ وحشت کا معرض وجود میں آنا مختلف اسباب کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔اسی طرح جس ماحول اور معاشرے میں انسان جنم لیتا ہے یا جس مجلس اور صحبت کا اثر لیتا ہے اگر وہ خود غرض عناصر کی آماجگاہ ہے تو وہ انسان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وجودیوں کے نزدیک ایک انسان کو وحشت کا سامنا اس وقت کرنا پڑتا ہے جب اس کے سامنے دو راستے ہوں اور اس نے کسی ایک کو اپنے لئے منتخب کرنا ہو۔انسان اپنے لئے ہمیشہ اچھے کا ہی انتخاب کرتا ہے یعنی جب انسان کے سامنے دو راستے ہوں اور اس کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ جو چاہے اختیار کرے اس کے ساتھ ساتھ عین ممکن یہ بھی ہے کہ وہ کسی ایسے راستے کا انتخاب کرے جو اسے برائی کی طرف مائل کر دے۔ کرکیگارڈ نے اس کی مثال کچھ یوں دی ہے

> ”جب حضرت آدمؑ کو شجر ممنوعہ کے قریب نہ جانے کا حکم ہوا لیکن اس کے باوجود انہوں نے وہ پھل کھالیا ایک طرف تو انہوں نے اپنی انتخاب کی آزادی کو استعمال کیا لیکن دوسری طرف وہ گناہ کے مرتکب ہوگئے ۔ انسان ہر لمحہ وحشت کا شکار ہوتے کیوں کہ اسے ہر وقت کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ وحشت ایک طرف گناہ کے ارادے اور اختیار سے منسلک ہے اور دوسری طرف آزادی اختیار کا احساس بھی ہوتا ہے۔“[۷]

کرکیگارڈ کے نزدیک گناہ اور آزادی کا یہ احساس تمام آدم کی اولاد میں موروثی طور پر موجود ہے۔ کرب وجودیت کا ایک اہم عنصر ہے وحشت کے تصور کے ساتھ ہی کرب کی کیفیت بھی وابستہ ہے۔وجودیوں کا کہنا ہے کہ انسان کرب کا سامنا اس وقت کرتا ہے جب وہ کشمکش جیسی صورتحال کا سامنا کر رہا ہوتا ہے۔ یعنی

انتخاب کی آزادی انسان کو کرب میں مبتلا کر دیتی ہے۔ علی عباس جلالپوری نے کرکیگارڈ کے افکار کی تشریح یوں کی ہے

> "اس نے ذہنی کرب اور تشویش کے تصورات پیش کیے وہ کہتا ہے کہ انسان فاعل مختار ہے جس کے باعث وہ خواہش بد اور گناہ کو اپنے اندروں میں پیدا ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے اسی قدر و اختیار کے باعث انسان جذباتی خلفشار میں مبتلا ہو گیا ہے"۔ (۸)

وجودی آزادی انتخاب کو کرب کی بڑی وجہ جانتے ہیں۔ انتخاب انسان کو تذبذب کی کیفیت سے آشکار کرتا ہے کہ آیا اس کا انتخاب درست ہے یا نہیں۔ اس صورتحال سے نجات اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان کوئی ایک راہ اختیار کر لیتا ہے۔

## لایعنیت

جیسا کہ اس لفظ سے ہی ظاہر ہے کہ ایک ایسا لفظ جس کا کوئی معنی نہ ہونا جیسے مہمل کلمے کے ساتھ آتا ہے لیکن اپنا کوئی معنی نہیں اسی طرح کسی چیز کا وجود جس کا کوئی مقصد نہ ہو لایعنیت کے زمرے میں آتا ہے۔ وجودیوں کے مطابق انسان اپنی مرضی سے دنیا میں آیا ہے نہ اپنی مرضی سے مرتا ہے وہ اسے بھی بے مقصد اور بے سود تصور کرتے ہیں۔ سارتر کے مطابق ہمیں اس دنیا میں پھینکا گیا ہے وہ دنیا کی ہر چیز کو لایعنی تصور کرتا ہے اس کے خیال میں یہ دنیا اور اس کی ہر چیز مہمل ہے کوئی اخلاقی اور اصول و ضوابط اس دنیا میں موجود نہیں ہیں جو ہمیں زندگی بسر کرنے کے لیے رہنمائی فراہم کریں۔ سارتر کے مطابق

> "یہ دنیا یا وجود خود ہمارے لیے لغو (Absurd)، مہمل اور بے معنی ہے۔
> یعنی ہم کائنات میں کسی قسم کے معانی اور مفہوم تلاش نہیں کر سکتے۔
> یہ ہمارے لیے کلیتہ عارضی، وقتی اور ناقابل فہم ہے"۔ (۹)

یہ کائنات بے رنگ ہے اسے ہم جو رنگ دے دیں گے یہ وہی اختیار کر لے گی۔ یہ وجودیت کا ایک غالب رویہ ہے اس سے مراد زندگی کا بے رنگ ہو جانا، ہر چیز کا بے مقصد ہو جانا۔ یہ ایک نفسیاتی کیفیت ہے جس میں انسان کو زندگی بے مقصد لگنے لگتی ہے اور یہ انسان کو خودکشی کی طرف مائل کرتی ہے کیونکہ انسان کو کسی

طرف سے اپنے مسائل کا حل نظر نہیں آتا اور وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ دنیا اسے لغو معلوم ہوتی ہے وجودیوں کے مطابق یہ دنیاہمارے لیے کوئی متعین راستہ نہیں رکھتی۔

## موت

دنیا میں جس طرح الفاظ اور متضاد بیان کئے گئے ہیں اسی طرح چند غیر مرئی عمل ہیں چند کے آثار تو دکھائی دیتے ہیں لیکن خود سے وجود دکھائی نہیں دیتا، جیسے زندگی اور موت۔ موت اس کیفیت کا نام ہے جب زندگی کا اختتام ہو جائے یوں تو جاگنا زندگی اور سونا موت کی علامات ہیں لیکن جب یکسر زندگی کا خاتمہ ہو جائے، سانس کا عمل دخل ختم ہو جائے تو وہ حقیقی موت ہوتی ہے۔ جب انسان اعمال کے اعتبار سے بے عمل ہو جائے تو وہ بھی اس کی عملی موت تصور کی جاتی ہے اور سوچ بچار کا مظاہرہ مفقود نظر آئے تو یہ ذہنی موت ہوتی ہے۔ حواس خمسہ میں سے جب بھی کوئی عضو کام چھوڑ جائے تو وہ بھی اس حس کی موت تصور ہوتی ہے۔ زندگی لطف وسرور کی کیفیت کا نام ہے جس میں زندگی کی مٹھاس ہوتی ہے اور کبھی کبھی کٹھن حالات میں یہ لطف ماند پڑ جاتا ہے۔ جب یکسر لطف کا اختتام ہو اور حواس کام چھوڑ جائیں وہ حقیقی موت ہے۔ موت کی کیفیت دکھ تکلیف اور یاس کا مرقع ہے۔ اس میں سب امیدیں ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ ہائیڈیگر کے افکار میں موت کا احساس اذیت کا باعث ہے

> ”انسان کچھ نہیں جانتا کہ وہ کہاں سے اس عالم آب و گل میں وارد ہوا
> نا اسے اپنی منزل کا کچھ علم ہے انسان چاروں طرف سے فنا اور نیستی میں
> گھرا ہوا ہے جس کا احساس اس کے لیے کربناک اذیت کا باعث ہوا۔
> موت اور فنا ایک ٹھوس حقیقت ہے اور ہر موجود کا عنصر لازم ہے“۔[۱۰]

موت کا عنصر انسان کو مایوسی کی طرف لے جاتا ہے انسان جب اپنی زندگی پر غور کرتا ہے کہ وہ فنا ہونے والی ہے تو وہ دہشت زدہ ہو جاتا ہے موت زندگی کا خاتمہ ہے۔ یہ زندگی کے کھوکھلے اور لایعنی پہلو کو سامنے لاتی ہے کرکیگارڈ نے اپنے افکار میں موت کو اس طرح بیان کیا ہے

> ”زندگی کی بے ثباتی کا احساسانسان کے دل میں کانٹا بن کر چبھتا رہتا ہے
> اور جب وہ بقائے دوام کا آرزومند ہوتا ہے تو صورت حال المناک ہو جاتی

ہے اور انسان اپنے آپ کو موضوع سمجھنے کے بجائے محض ایک شے سمجھنے لگتا ہے"۔(۱۱)

سارتر کہتا ہے کہ نہ ہمیں اپنی مرضی سے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے اور نہ ہی کسی کو موت پر اختیار حاصل ہے۔ ہائیڈیگر کے مطابق موت ہمیں مایوسی کی طرف مائل کرتی ہے انسان کو اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اور نہ ہی اسے یہ علم ہے کہ اگلے لمحے اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے یہ خوف انسان کو مایوس کر دیتا ہے۔

## خود غرضی

زندگی کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان دوسروں کے کام آئے اور معاشرتی حیوان ہونے کا ثبوت دے جہاں اپنے لیے اوقات کار مقرر کرتا ہے وہاں دوسروں کے لئے بھی ابھی ان اوقات سے حصہ نکالے۔۔ جہاں اپنے لئے دولت جمع کرتا ہے وہاں اس دولت میں سے اس طبقے کے لیے بھی حصہ رکھے جو مشکل سے ایام زیست کی گزر بسر کرتے ہیں۔ انسان میں جب اپنا الو سیدھا کرنے کے مصداق عمل شروع ہو جائے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ خود غرضی نے جنم لے لیا۔ ایسے انسان کو اپنے وجود تک ہی محدود ہونا پڑتا ہے وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کی خاطر دوسروں کو قربانی کا بکرا بنانے سے گریز نہیں کرتا۔ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے دوسروں کے حقوق غضب کرلیتا ہے اپنی زندگی کو دوسروں کی زندگی پر مقدم جانتا ہے اور حلال و حرام کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ بس ایک ہی دھن میں مگن ہو کر اپنے راستے کو صاف کرتے جانا خواہ اس میں کسی دوسرے کی زندگی کو صفحہ ہستی سے کیوں نہ مٹانا پڑے۔ اپنی منزل و مقصود اپنی واحد ذات کو تصور کرنا یہ کیفیت خوف خدا کو خود کر دیتی ہے۔ انسان جب معاشرتی روایات اور اقدار کو کھو دیتا ہے تو وہ خود غرض ہو جاتا ہے صرف اپنے فائدے کے لیے کوشاں رہتا ہے اُسے دوسروں کی دکھ اور تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔ مایوسی اور تنہائی انسان کو خود غرض بنا دیتی ہیں اور انسان صرف اپنی ذات کے لیے سوچتا ہے وہ دوسروں کو نقصان یا دکھ پہنچا کر خود خوش رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ علی عباس جلالپوری اس حوالے سے لکھتے ہیں

"نظر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ بیگانگی میکانکیت کی نہیں بلکہ فردیت کی پیداوار ہے میکانکی معاشرے میں فردیت نے جس تنہائی اور محرومی کے احساسات کو جنم دیا ہے وہ سرمایہ دار معاشرے کی زائیدہ ہے جس میں ہر شخص ذاتی مفاد کی پرورش میں کوشاں ہے

اور ذاتی مفاد کی خاطر اجتماعی مفاد کو پاؤں تلے روندنے میں کوئی دریغ محسوس نہیں کرتا۔ یہی خود غرضی اور فسادات قلبی اپنی ذات سے بیگانگی کا اصل سبب ہے۔"(۱۲)

## سائنسی تشکیک

وجودیت کی تحریک کا آغاز سائنسی ترقی کو بھی سمجھا جاتا ہے کچھ وجودی فلسفی سائنس کی مخالفت کرتے ہیں ان کے مطابق انسان کے داخلی جذبات و کیفیات کو سائنسی طریقے سے نہیں پرکھا جا سکتا۔ جہاں سائنس نے انسان کو سہولیات فراہم کیں وہیں انسانی تحفظ کو بھی ٹھیس پہنچائی۔ انسان مشین کا غلام بن کر رہ گیا آدمی، آدمی کے لئے اجنبی ہو گیا انسانی رشتے بکھر گئے اس سائنسی ترقی کے نتیجے میں ایسا انسان پیدا ہوا جو جذبے اور احساس سے عاری تھا اس نے تنہائی اور مایوسی کی فضا قائم کر دی۔ انسان جہاں سائنسی ترقی کی وہیں انسانی موت کا بازار بھی گرم کیا انسان کا چین اور سکون اس سے چھن گیا۔ زندگی کو آسائشوں میسر آئیں تو خوف کے سائے پوری زندگی لمحہ بہ لمحہ ساتھ ہونے لگے۔ جدت نے انسانی دماغ کا استعمال مشینوں سے وابستہ کر لیا لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع کم ہو گئے جہاں سینکڑوں لوگ کام کرتے تھے وہاں ایک مشین نے سب کی منہ سے نوالہ چھین لیا۔ منفی رجحانات پروان چڑھنے لگے اور جب لوازمات زندگی پورا کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوا تو ہر جائز و ناجائز عمل پر عمل پیرا ہو کر زندگی کو دوام بخشنے کے لئے کوشش کی جانے لگی۔ امیر امیر تر ہوتا جا رہا ہے اور غریب غربت کے گڑھے ہیں دھنسا جا رہا ہے۔ عدم توازن کی فضا سائنسی ترقی کے ذریعے ہی پروان چڑھی۔ انسان نے مشینوں کو تو ایجاد کر لیا لیکن خود ان کا غلام بن گیا۔ عزیز رشتہ داروں سے دوری اختیار کر لی اور خود کو تنہا کر دیا۔ کرکیگارڈ کے سائنسی استدلال کے نظریات کی وضاحت علی عباس جلال پوری نے یوں کی ہے:

"معروضی استدلال جس سے سائنس کام لیتی ہے غلط ہے کیوں کہ صرف موضوعی انداز فکر سے انسانی مسائل اور عقدوں کو حل کیا جا سکتا ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی پہلو سے یکتا اور بے مثال ہے اس لیے اس کا نقطہ نظر بھی منفرد اور یکتا ہوتا ہے۔"(۱۳)

مندرجہ بالا وجودی عناصر وہ ہیں جن سے انسان یاسیت کی طرف مائل ہوا اورانسان میں منفی رویہ پروان چڑھایااس لیے ان کو قنوطی وجودی عناصر کانام دیا جاتا ہے۔

## ۲۔ رجائی وجودی عناصر

فلسفہ وجودیت میں رجائی عناصر سے مراد ایسے عناصر ہیں جنہوں نے انسان کویاسیت زدہ ماحول سے نکال کر زندگی کی طرف مال کیا۔
درج ذیل رجائی عناصر ہیں:

### امید

امید زندگی ہے اور جب امید یا آس ساتھ چھوڑ جائے تو نا امیدی اور یاس جنم لیتی ہے جو موت کا ایک زینہ ہے۔ ہر ایک تاریک رات اس امید کے ساتھ گزاری جاتی ہے کہ آنے والا کل ابھرتے ہوئے سورج کی کرنوں سے منور ہو جائے گا اور تاریکی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ امید ڈھارس ہے جو ہر دم آگے بڑھنے کی ترغیب دیتی ہے ہمت اور حوصلہ جنم دیتی ہے سب کچھ کر گزرنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ امید حوصلہ بڑھاتی ہے تھکاوت ہونے کے باوجود انسان ایک ایسی راہ پر گامزن ہونا پسند کرتا ہے جو کٹھن اور دشوار ہو۔
وجودی فلسفے میں امید کا عنصر ایسا تھا جس نے انسان کو خوش حال زندگی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی۔ جب انسان چاروں طرف سے مایوس ہو چکا تھا تو تب اس کو صرف اپنا وجود ایسا معلوم ہوا کہ جس پر وہ بھروسہ کر سکتا تھا اور اس کو بنیاد بنا کر انسان نے اپنے مسائل کا حل نکالنا شروع کیا۔ کرکیگارڈ کہتا ہے کہ اس مایوسی کے رویے سے نکلنے کے لیے جو امید دلائی وہ انسان کا داخل ہے۔ "اس کشمکش سے صرف مسیح منجی ہی انسان کو نجات دلا سکتا ہے۔"(۱۴) یہ وہ جگہ ہے جہاں اُسے پناہ مل سکتی ہے اور وہ دوبارہ زندگی کو خوشحالی کی طرف گامزن کیا جا سکتا اس عنصر کو صرف مذہبی اور مشرقی وجودیت میں جگہ ملی۔ مذہبی وجودیت کا فلسفی مارسل بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتا اس کے مطابق انتہائی نامساعد حالات میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔

### جدوجہد

جدوجہد رجائیت کا عنصر ہے جو ہر دم نت نئی ہمت و حوصلے سے کام کو رواں دواں کرنے کے لیے سعی مسلسل ہے۔ اس صنف رجائیت میں روانی و تسلسل کا عنصر پایا جاتا ہے اس کے لیے وقت کا تعین ممکن نہیں ہے۔ ہر کام

کے لیے جہدِ مسلسل کا دورانیہ مختلف ہوتا ہے کچھ مختصر دورانیہ کے بعد ہی ثمر بار ہو جاتی ہے اور کچھ عوامل کئی صدیوں پر محیط ہوتے ہیں۔ کوئی بھی کام ہتھیلی پر سرسوں اگانے کے مترادف نہیں ہوتا اس کے پس منظر میں ایک تحریک ہوتی ہے اس تحریک کے عناصر اور کرداروں کی بے شمار کاوشوں کی بدولت منطقی انجام تک پہنچنے کا دورانیہ ہوتا ہے۔ جہد مسلسل سے پانی کا ایک ایک قطرہ پتھر کی سلوں کو گھسا کر رکھ دیتا ہے اور پانی اپنی روانی اور جہد مسلسل کی چھاپ پتھر پر بھی چھوڑ جاتا ہے گویا جہد مسلسل کے آگے ناممکن نہیں ہوتا۔ ناامیدی اور یاس کا تریاق بن کر حصول منزل کی طرف گامزن ہونے کا نام جہد مسلسل ہے۔

مسلسل کوشش وہ ذریعہ ہے جس سے انسان آخر کار اپنی منزل مقصود کو حاصل کر سکتا ہے۔ مشرقی ادباء نے اپنی تحریروں کے ذریعے فرد کو یہ باور کروایا کہ مسلسل جدوجہد اور کوشش سے ہی وہ اپنی منزل حاصل کر سکتا ہے اور ایک خوشگوار زندگی بسر کر سکتا ہے۔

خود آگاہی

خود آگاہی سے مراد اپنے وجود کے بارے میں جاننا کہ اس دنیامیر اکیا مقام ہے؟ میری تخلیق کا کیا مقصد ہے؟ یہ وہ باتیں ہیں جن کو جاننے کے لیے انسان ازل سے اس کاوش میں مصروف ہے۔ عام طور پر انسان جس معاشرے میں رہتا ہے وہاں کے نظم وضبط اور قوانین سے آگاہ رہتا ہے اور یہ لاشعوری طور پر انسان کے ذہن میں موجود رہتی ہیں، وہ معاشرے میں اپنے مقام اور اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ رہتا ہے۔ لیکن کائنات میں اس کا مقام کیا ہے یا اس کی ذمہ داری ذمہ داریاں کیا ہیں ان باتوں سے وہ غافل رہتا ہے جب کہ یہ کائنات بھی ایک ضابطہ کے تحت چل رہی ہے۔ انسان کو کائنات کے نظام پر غور کرنے اور اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں جاننے کے لیے اپنی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرنی پڑتی ہے اور اپنے داخل کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ کر کیگارڈ کے مطابق انسان اپنے مسائل کا حل اپنے داخل میں جھانک کر تلاش کر سکتا ہے یعنی خارجی مسائل کا حل انسان کے داخل میں موجود ہے۔ خود آگہی وجودیت کا ایک اہم عنصر ہے جس نے داخلیت پر زور دیا اور وجودیت کو داخلیت سمجھا جانے لگا مشرق میں خود آگہی یا عرفان ذات وجودیت کی تحریک سے پہلے بھی موجود تھا۔ بقول جمیل جالبی

”مشرق میں عرفان ذات حاصل کرنا کوئی نئی بات تو نہ تھی لیکن مغرب میں

اس فلسفے نے بحران زدہ انسان کو دوبارہ زندگی کی طرف توجہ دلائی۔"(۱۵)

خود آگاہی کے ذریعے انسان اپنے داخل کی طرف رجوع کر کے اپنا کھویا ہوا مقام اور وقار بحال کر سکتا ہے۔ خود آگاہی ہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسان کی انفرادیت نقطہ کمال تک پہنچتی ہے جہاں فرد حقیقی معنوں میں فرد بن جاتا ہے۔

## آزادی

آزادی انسان کی بنیادی قدر ہے انسان اپنے اعمال وافعال کا خود ذمہ دار ہے اور وہ اس لیے کوئی بھی راہ متعین کرنے میں آزاد ہے۔ انتخاب میں آزادی صرف اشرف المخلوقات کے لیے ہے۔ انسان خود اپنے لیے اخلاقی اقدار متعین کرتا ہے اور ان کا ذمہ دار بھی خود ہے۔ آزادی کا مقصد انسان اپنی اصلیت کے مطابق زندگی گزارنے کا تعین خود کرے فرد وجود کو مصدقہ بنانے کے لیے انتخاب کی آزادی کا استعمال کرتا ہے اور اپنا اخلاقی معیار متعین کرتا ہے۔ سارتر کے مطابق انسان اپنے تمام اعمال میں آزاد ہے کوئی اخلاقی ضابطہ مقرر نہیں ہے جس کے مطابق زندگی بسر کی جاسکے اور اس انتخاب کے عمل میں ہر لمحہ انسان کو کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور اس وقت وہ مکمل طور پر آزاد ہوتا ہے۔ اپنے وجود کو مصدق بنانے کے لیے اسے انتخاب کرنا پڑتا ہے اور اس عمل کے دوران وہ جن کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے ان سے اس کی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ سارتر استحصالی نظام سے متنفر تھا اس کے مطابق فرد کی انفرادیت ایک آزاد معاشرے میں ہی بحال رہ سکتی ہے جہاں وہ اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہو اور کوئی بھی فیصلہ کرنے میں آزاد ہو۔

## جوش عمل

جوش عمل سے مراد وہ جذبہ اور ولولہ ہے جو کسی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کارفرما ہوتا ہے۔ تمام تر اعمال وافعال اس رجائی کیفیت کے مرہون منت ہوتے ہیں جب یقین کامل ہو جائے کہ میری کاوش ایک دن رنگ لے آئے گی تو یہ جذبہ انسان کے اندر موجزن ہو جاتا ہے۔ جو اپنی ہمت و تسلسل کی لہروں سے بڑے بڑے پہاڑ کو رائی کے برابر کر کے چھوڑتا ہے۔ جس کام میں یہ جذبہ کارفرمانہ ہو اس کا منطقی انجام کو پہنچنا محال ہوتا ہے مشکلات سر اٹھانا شروع کر دیتی ہیں اور ناکامی راستہ ہموار کرنا شروع کر دیتی ہے۔ جوش عمل وہ جذبہ ہے جو کام میں جان ڈال دیتا ہے رفتار کو بڑھاتا ہے اور کبھی یاس اور نا امیدی کو پاس بھی پھٹکنے نہیں دیتا اس

عمل سے دلوں کی ڈھارس بندھتی ہے۔ کوئی بھی راہ منتخب کرنے کے لئے یا کوئی بھی فیصلہ کرنے کے لئے فرد کے اندر جوش عمل کا ہونا ضروری ہے۔

## (ج) وجودیت کا مغربی و مشرقی تناظر

سائنسی ترقی نے جہاں دنیا کو ترقی یافتہ بنایا وہاں ہی انسان کے لیے لاکھوں مسائل بھی لا کھڑا کر دیے۔ بم ایجاد تو کر لیا لیکن اس کا استعمال انسانی جانوں کو ہی ختم کرنے کے لئے کیا گیا۔ انسان، انسان کا دشمن بن گیا ان سب حالات میں انسان کو داخلی زندگی ہی ایسی جگہ ملی جہاں اس نے پناہ لی یہ وہ عوامل تھے جن کے باعث وجود کے مسائل سامنے آئے اور وجودیت نے جنم لیا۔ وجودیت کے دو رخ ہیں؛ ایک الہیاتی وجودیت اور دوسرا غیر الہیاتی وجودیت جسے دہریت کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

### ا۔ وجودیت کا مغربی تناظر

### الٰہیاتی وجودیت

الٰہیاتی وجودیت کا بانی سورن کرکیگارڈ ہے جس کا تعلق ڈنمارک سے ہے۔ کرکیگارڈ نے ہیگل کے نظریات کے خلاف آواز بلند کی۔

> ”سب سے پہلے توانا آواز جو مطلقیت کے خلاف بلند ہوئی وہ کرکیگارڈ کی تھی جس
> نے ہیگل کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے کہا جب میں سوچتا ہوں کہ میں ایک
> عظیم الشان نظام کا ایک چھوٹا سا بے حصہ ہوں تو میں لرز اٹھتا ہوں۔“[۱۲]

کرکیگارڈ کے نظریات کو اُس کی وفات کے بعد بہت مدت تک پذیرائی نہ ملی لیکن عالمی جنگوں کے اختتام پر جب ہر طرف صرف تباہی و بربادی تھی تو کرکیگارڈ کے نظریات نے مقبولیت حاصل کی۔ اس نے انسان اور خدا کے درمیان تعلق اور رویے کو زیر بحث لایا۔ کرکیگارڈ چونکہ مذہبی مفکر تھا اور خدا کی ذات پر یقین رکھتا تھا وہ فرد کے ذاتی تشخص اور شناخت کو اس عظیم الشان دنیا میں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک اصل سچائی، فرد اور

موضوعیت ہے۔ فرد کی داخلی کیفیات کا جائزہ لینے کے لیے سائنسی طریقہ کار اور منطقی طریقہ کار کے خلاف تھا۔ اس نے موجودہ صورتحال کا جائزہ لینے کے لئے وجدانی کیفیات کو ترجیح دی۔ اُس کا ماننا ہے کہ انسان جب اپنی ذات کا جائزہ موضوعی طور پر لیتا ہے تو اپنی نجی کیفیات سے آشکار ہوتا ہے جو کسی بھی خارجی عمل کی پیدا کردہ نہیں ہوتی ہیں۔ کرکیگارڈ کہتا ہے کہ انسان اپنا دوبارہ مقام حاصل کر سکتا ہے اگر وہ خدا کی طرف رجوع کرئے مایوسی کی اس کیفیت سے نکلنے کا واحد راستہ عرفان خداوندی ہے ۔وہ وجود کے سفر کے تین مراحل بیان کرتا ہے

> ''پہلا مرحلہ جمالیاتی یا حسی ہے، جس میں انسان کا مقصد مادی خواہشات اور آسائشوں کا متلاشی ہونا ہے اوراس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔
> دوسرا مرحلہ اخلاقی ہے جس میں وہ اخلاقی ضابطے کے تحت اپنی زندگی گزار رہا ہوتا ہے وہ معاشرے میں رہتے ہوئے اخلاق اور روایات کا پابند ہوتا ہے
> تیسرا مرحلہ مذہبی ہے جس میں فرد عرفان خداوندی حاصل کر لیتا ہے اور خدا سے براہ راست رابطہ قائم کر لیتا ہے یہاں اخلاقی سفر سے روحانی سفر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے اور اخلاقی ضوابط بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔''[۱۷]

کرکیگارڈ نے جن وجودی کیفیات کو بیان کیا ہے ان میں تنہائی، وحشت اور کرب ہے۔ وہ خود کو تنہا فاختہ کی مانند قرار دیتا ہے جو کسی خزاں رسیدہ درخت کی شاخوں پر بیٹھی ہو۔ وہ خوف اور وحشت کو دوالگ الگ کیفیات قرار دیتا ہے خوف کسی چیز یا شخص کا ہوتا ہے لیکن انسان کو وحشت کا سامنا اس وقت کرنا پڑتا ہے جب اس کے سامنے دو راستے ہیں اور اسے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو پھر اس کا انتخاب صرف اپنے لیے نہ ہو بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہو۔ وجودیت کو باقاعدہ الہیاتی وجود کی شکل جبرئیل مارسل نے دی۔ مارسل، کرکیگارڈ کا شاگرد تھا اس نے کرکیگارڈ کی موت کے بعد اس کے افکار اور نظریات کو مدون کر کے باقاعدہ نظریے کی شکل دی۔ جبرئیل مارسل نے ہیگل کے نظریات کا مطالعہ کیا۔ اس کے نزدیک موجودہ دور کا انسان مایوسی اور اداسی کی کیفیت سے اسی صورت میں نکل سکتا ہے اگر وہ اپنا تعلق خدا سے جوڑ دے۔ وجودی فلسفے میں جبریل مارسل کو اہمیت کرکیگارڈ کے نظریات کو مربوط کرنے کی وجہ سے حاصل ہوئی اس نے کرکیگارڈ کے منتشر اور غیر واضح نظریات کو منظم اور واضح کر کے پیش کیا اس کے علاوہ اس نے سائنسی ترقی کی بھی مخالفت کی۔

"انسان آلات کی تخلیق اور ان کا استعمال اپنی آسودگی اور تشفی کے لیے کرتا ہے
مگر رفتہ رفتہ وہ خود ان حالات کا غلام بن جاتا ہے کیونکہ یہ آلات ہی انسان پر قابو
پالیتے ہیں یہ صورت حال صرف تکلیف دہ ہی نہیں بلکہ انسانی وجود کے لیے مہلک
بن جاتی ہے۔"(۱۸)

جبریل مارسل کے مطابق خود غرضی، نفرت، فریب اور بے وفائی یہ تمام عناصر سائنس کی پیداوار ہیں۔ مصنوعی وجود انسان کو ایک ایسا آلہ بنا دیتا ہے جو نہ تو خود کا بنتا ہے نہ کسی دوسرے کا بلکہ وہ وقت کے دھارے میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔مارسل انسانی فکر کی منزل کی تلاش کے لیے ذاتی تجربات کی بات کرتا ہے وہ انسان کی تنہائی اور علیحدگی کے احساس پر قابو پانا چاہتا ہے۔اُس کے خیال میں سماجی گروہ یا کسی جماعت میں رہ کر انسان اپنی خصوصیات سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور اس کے باہمی رشتے ٹوٹنا شروع ہو جاتے ہیں اس کے ساتھ ہی اس کی تمام صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں انسان جب لالچی ہو جاتا ہے تو وہ صرف صرف اپنے فائدے کے لیے سوچتا ہے اور اشیاء کے حصول کا غلام بن جاتا ہے۔اس مقام پر انسانی وجود کی گمشدگی کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے انسان اپنے رشتوں اور اخلاقی اقدار کو بھلا دیتا ہے وہ مشکل حالات میں بھی دوسروں کے کام نہیں آسکتا۔مارسل کے نزدیک ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ان حالات میں وجود کا نزول ہو جو انسان کو تباہ و برباد ہونے سے بچالے۔

یاسپرس نے فرد کی انفرادیت اور داخلیت کی طرف دلچسپی لی۔وہ نفسیاتی امراض کا ماہر تھا جنگی حالات نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ انسان کو اس وقت پریشانیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب وہ اپنے داخل سے ناواقف ہو جاتا ہے اور بیرونی معاملات میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔یاسپرس کے نزدیک انسانی وجود اس وقت نکھرتا ہے جب وہ کسی مصیبت یا پریشانی کا سامنا کر رہا ہو کیونکہ ایسے حالات انسان کے لیے خود آگہی کے موقع فراہم کرتے ہیں۔وہ انسان کے ماضی اور مستقبل کے بارے میں بات کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان کا ماضی غیر مکمل ہے اور مستقبل کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا ایک حال ہی ہے جو واضح تصویر فراہم کرتا ہے وہ حال کے بارے میں پر امید نظر آتا ہے۔

## غیر الٰہیاتی وجودیت

غیر الٰہیاتی وجودیت کے ماننے والے خدا کے وجود سے انکار کرتے ہیں ان کے نزدیک خدا موجود نہیں ہے۔ ان فلسفیوں میں نمایاں فلاسفر ہائیڈیگر، سارتر اور البرٹ کامیو ہیں۔ غیر الٰہیاتی وجودیت کا بانی ہائیڈیگر ہے وہ فلسفے کا استاد تھا اس کا پسندیدہ فلسفی نٹشے تھا۔ شروع میں مذہبی خیالات رکھتا تھا لیکن بعد میں مذہب سے بغاوت کر دی۔ ہائیڈیگر کے ہاں سب سے اہم عنصر زمانیت ہے۔ اس کے خیال میں انسان کے داخلی وجود کی تشکیل ہمارے احساسات اور جذبات کے ذریعے ہوتی ہے جیسے موت کا احساس اور پریشانیاں ہیں۔ ان کی وجہ سے ہی انسانی وجود بنتا ہے یا ڈوبتا ہے۔ اس کے خیال میں وقت کا احساس ایک لمحے کے لئے بھی ہم سے الگ نہیں ہو سکتا یہ ہمارے تجربات کو ماضی اور حال سے منسلک کرتا ہے۔ ہائیڈگر کے خیال میں انسانی زندگی میں موت وہ عنصر ہے جس کا احساس انسان کو ہر لمحہ رہتا ہے اور وہ اس موت کے خوف میں مبتلا ہو کر محض کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔ یہ انسانی وجود کا تنزل ہے اس کے نزدیک انسان اس صورتحال پر قابو پا سکتا ہے اس کے لیے انسانی وجود کی وہ صلاحیت چاہیے جو اپنی ناکامیوں پر غالب آجاتی ہے۔

غیر الٰہیاتی وجودیت کا سب سے بڑا نمائندہ ژاں پال سارتر ہے سارتر کا مشہور مقولہ ہے وجود جوہر پر مقدم ہے۔ سارتر کے مطابق انسانی فطرت نام کی کوئی چیز نہیں انسان جو کچھ ہوتا ہے وہ خود بنتا ہے پہلے سے کچھ بھی طے کر نہیں ہوتا۔ انسان محض ایک وجود کی صورت میں اس دنیا میں آتا ہے اس دنیا میں آنے کے بعد خود کو جیسا چاہے بنا دے۔ اس کے خیال میں انسانی وجود کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کا مقصد پہلے ہی سے طے کر دیا گیا ہو وہ پینسل تراش کی مثال دے کر یہ واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ جیسے اس کے بنانے والے کے ذہن میں اس کا مقصد ہوگا تب ہی اس نے تراش کو تخلیق کیا ہوگا اس کے برعکس وہ خدا سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا موجود ہی نہیں ہے اور انسانی وجود یا انسانی فطرت پہلے سے متعین کردہ نہیں ہے یعنی انسان کا وجود پہلے آتا ہے اور جوہر بعد میں، انسان خود اپنا جوہر بناتا ہے۔

سارتر شعور کو وجود برائے خود کا نام دیتا ہے اور دنیا کی دوسری چیزوں کے لیے وجود بذات خود کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ لاشیعیت ایسی چیز ہے جو وجود برائے خود کو وجود بذات خود سے الگ کرتی ہے سارتر کا کہنا ہے

"انسانی وجود لاشیعیت کا مرہون منت ہے اور شعور کو نامکمل قرار دیتا ہے۔

وجود برائے خود غیر مستقل ہے اور وہ اپنی تکمیل کے لیے وجود بذات خود

بنناچاہتا ہے لیکن ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کا الٹ

ہیں اسی وجہ سے انسان ایک ناکام جذبے کی طرح ہے۔" [۱۹]

سارتر کا کہنا ہے کہ تصور خدا میں تضاد ہے وجود برائے خود اور وجود بذات خود کے ذریعے ہم اس ناکام جذبے کو لامتناہیت تک لے جاتے ہیں تو وہ خدا بن جاتا ہے یعنی ایک ایسی ہستی کا تصور کرتے ہیں جو ایک ہی وقت میں وجود برائے خود بھی ہوں اور وجود بذات خود۔ شعور اور خارجی دنیا دونوں کو ملانے کی کوشش ہے جو کہ ناممکن ہے۔

"خدا میں موجود برائے خود اور وجود بذات خود کی صفات جمع نہیں ہو سکتی

اس لئے خدا ممکن الوجود نہیں بلکہ خدا کا تصور ہی خود تردیدی پر مبنی ہے۔" [۲۰]

سارتر دنیا کو لغو قرار دیتا ہے اس کے خیال میں دنیا کی کسی چیز کا کوئی معنی و مفہوم نہیں ہے ہم اپنی مرضی سے اس دنیا میں نہیں آئے ہیں یعنی ہماری مرضی کے مطابق ہمارا وجود اس دنیا میں نہیں آیا ہے بلکہ اس دنیا میں رہنا ہماری مجبوری ہے جو ہمارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی لیے اور نہ ہی زندگی گزارنے کے لئے کوئی متعین راستہ بتاتی ہے۔ یہ دنیا بے رنگ ہے ہم جو رنگ اسے دے دیں یہ وہی قبول کر لیتی ہے کوئی بھی طرز زندگی یا عقائد کو قبول اور ترک کرنے کی وجہ نظر نہیں آتی۔ سارتر کا ماننا ہے کہ وجود ایک ایسا پھندا ہے جس میں انسان کو ڈالا گیا ہے اور آزادی انتخاب اس کے لئے سزا ہے جب ہم کسی چیز کا انتخاب کرتے ہیں تو وہ صرف اپنی ذات کے لیے نہیں ہوتا بلکہ پوری انسانیت کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ اس ذمہ داری کے احساس سے انسان وحشت میں مبتلا ہو جاتا ہے جو شخص انتخاب کے اس عمل سے گزر جاتا ہے وہ اپنے وجود کو مصدق بنا دیتا ہے

البرٹ کامیو نے بھی اپنی تحریروں میں لغویت کو بیان کیا وہ دنیا کی ہر چیز کو لغو قرار دیتا ہے اس نے اس فلسفے کو اپنے ناول اجنبی میں بیان کیا۔ اس ناول میں دنیا کی بیگانگی کا ذکر کرتا ہے اور خود کو اتنا بیگانہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنی والدہ کے جنازے پر بھی کسی غم والم کو ظاہر نہیں کرتا جبکہ وہاں موجود لوگوں کے احساس غم کو حیرت سے دیکھتا ہے۔ البرٹ کامیو انسان کے وجود کو ایک نازک شے تصور کرتا ہے جو کہ ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جاتا ہے وہ دنیا کی ہر چیز کو ناقابل اعتبار سمجھتا ہے۔ انسان جو کہ ہر وقت مہمل حالات میں گھرا ہوتا ہے وہ ہوس اور خود غرضی کی وجہ سے ہے۔ کامیو کے افکار میں قنوطی عناصر باقی تمام فلسفیوں سے کہیں زیادہ ہیں اس کے

خیال میں اس مہمل دنیا سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے ایک ہی حل ہے اور وہ خودکشی ہے۔خودکشی کو اس کے فلسفے میں بہت اہمیت حاصل ہے اس کے نزدیک انسان نے اس لغو دنیا میں رہنے کا فیصلہ خود کیا ہے اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے انسان دوستی ایک ایسا وطیرہ یا مسلک ہے جو ہر انسان کو زندہ رہ کر نبھانا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس دنیا سے لغویت ختم ہو جاتی ہے متھ آف سی فس میں سسی فس کا کردار ایسا ہی ہے۔

''انسان یونانی دیومالا کے ایک ذمہ دار شخص کی طرح اس کو دیوتاؤں نے ابدی طور پر
اس کام میں مصروف کر دیا ہے کہ وہ ایک چٹان کو پہاڑ پر لے جانے کی صرف اس لیے
کوشش کرتا ہے کہ وہ ہر بار واپس لڑھک کر اس جگہ پہنچ جائے۔''[۲۱]

البرٹ کامیو اس عزم اور ہمت کو اہمیت دیتا ہے جو کہ انسان بے مقصد دنیا میں مصروف رکھتا ہے اور انسان کو ان بے مقصد حالات میں رہنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

## ۲۔وجودیت کا مشرقی تناظر

اردو ادب میں آنے والی زیادہ تر تحریکوں کا تعلق مغرب سے ہے وجودیت بھی مغرب سے آنے والی تحریکوں میں سے ایک تحریک ہے لیکن مشرق میں اس تحریک کو قدرے بدلی ہوئی شکل میں اپنایا گیا کیونکہ مغرب میں اس سلسلے میں خدا سے انکار کے ماننے والے بھی تھے ہمارے یہاں اس تصور کو تسلیم نہیں کیا گیا اس تحریک کے پس پردہ عوامل ایسے تھے جو کہ ہمارے معاشرے میں بھی موجود تھے اس لیے ہمارے ادبا اور شعرا کے ہاں بھی وجودی عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ادیب اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے اور کوئی بھی فنکارہ معاشرے سے قطع نظر تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ ۶۰ء کی دہائی میں جب وجودیت مشرقی افکار میں نمایاں ہوئی تو اس وقت ملکی حالات ایسے تھے جنہوں نے اس فلسفے کو فروغ بخشا اور اس کے تناظر میں ادب تخلیق کیا جانے لگا۔ تقسیم پاکستان کے بعد انسان عدم تحفظ کا شکار ہو گیا تھا داخلی کرب نے انسان کو تنہائی دہشت کا شکار کر دیا اگرچہ مشرق میں کوئی واضح فلسفہ نہیں ہے اس لیے وجودی عناصر ہمیں یکجا صورت میں نظر نہیں آتے۔

''قیامِ پاکستان کے بعد کے حالات، ملک میں اظہار پر پابندی، مارشل لا، ملک کا دو حصوں

میں تقسیم ہونا یا آج کا معاشی اور سیاسی بحران یہ سب عناصر مل کر کسی اردو ادب کے فن پارے میں وجودی کرب کا باعث بنتے ہیں اس لیے مغرب کے برعکس اردو ادب میں یہ عناصر بکھری ہوئی شکل میں نظر آتے ہیں۔"(۲۲)

ذیل میں چند مشرقی ناقدین کی آراء کا جائزہ لیا جائے گا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی وجودیت کی تائید کرتے ہیں ان کے خیال میں اس فلسفے نے انسان کی خود اعتمادی کو بحال کیا اور ناامیدی سے نجات دلائی۔ مشرق میں عرفان ذات حاصل کرنا کوئی نئی بات تو نہ تھی لیکن مغرب میں اس فلسفے نے بحران زدہ انسان کو دوبارہ زندگی کی طرف توجہ دلائی۔ مغرب کی سائنسی ترقی نے جہاں انساں کو طاقتور بنا دیا وہاں اسے ایسے مسائل کے سامنے لا کھڑا کر دیا جو اس کی تباہی کا باعث بن گئے۔ ان حالات میں وجودی فلسفی نے انسان کو داخل کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ سائنس اور عقلی دلائل تمام مسائل کا حل نہیں ہو سکتے جمیل جالبی اس بارے میں کہتے ہیں کہ یہ کوئی نیا فلسفہ نہیں لیکن حالات نے مختلف اقدار کو یکجا کر کے اسے نیا رخ دے دیا فلسفہ جو صرف مجرد اشیا اور خیالات تک محدود ہو گیا تھا اس نے دوبارہ فرد کے مسائل کی طرف توجہ کی۔ وجودیت نے یہ باور کروایا کہ داخلیت کے ذریعے خارجیت کو بدلا جا سکتا ہے۔ وجود جوہر پر مقدم ہے اس مقولے کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کو اللہ تعالی جب تخلیق کرتا ہے تو اس کے علم میں ہوتا ہے کہ وہ کیوں تخلیق کر رہا ہے لہذا انسان کا جوہر خدا کے ذہن میں پہلے سے تھا اسے انسانی فطرت کا بھی نام دیا جاتا ہے لیکن مغرب میں جو کہ خدا سے ہی انکار ہے تو انسانی فطرت یا انسانی جوہر کی بات ہی نہیں رہتی ہے۔

" انسان پہلے وجود میں آتا ہے اور خود کو متعین کرنے کے لیے مستقبل کی طرف بڑھتا ہے اور وہ خود بھی اس امر سے آگاہ رہتا ہے کہ وہ ایسا کر رہا ہے۔" (۲۳)

جمیل جالبی داخلیت کا مفہوم واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان مجرد چیزوں کی نسبت زیادہ اہمیت کے حامل ہے اور ان چیزوں پر اسے برتری حاصل ہے عرفان ذات داخلی تجربات تخلیق کا مقصد جیسے مسائل اردو ادب کا موضوع بنے رہے وجودیت کا یہ پہلو مشرقی نظریات کے بہت قریب رہا۔ "اس فلسفے کی مدد سے ہم اس دور میں اپنے حقیقی مزاج کے احیا کا کام لے سکتے ہیں اور یہ ہمارے مزاج میں رنگ کر ہماری تخلیقی صلاحیتوں میں دوبارہ روح پھونک سکتا ہے۔"(۲۴) جمیل جالبی نے وجودیت کے مثبت پہلو کو زیر بحث لایا اور اس سلسلے میں

اس کی تائید کی۔ ان کے نزدیک اردو افسانے کے لیے یہ ایک اہم موضوع ہے اس کے ساتھ وجودی عناصر بیچارگی اور یاسیت کی تشریح بھی کی ہے۔
حسن عسکری نے وجودیت کو بیسویں صدی کے فلسفوں میں سب سے نمایاں فلسفہ قرار دیا ہے اور اس فلسفے کو ادب نے سب سے زیادہ فروغ دیا۔ انسان کے اندر جو اپنے وجود کا احساس پیدا ہوتا ہے تو اسے کوئی داخلی فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور ایسے فیصلے ہر وقت انسان کے سامنے رکھتے ہیں کیونکہ فرد کو ہر وقت کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا پڑتا ہے لہذا اس کی ماہیت بھی مستقل طور پر متعین نہیں ہو سکتی۔

"۱۔ اپنی ماہیت کا تعین انسان خود کرتا ہے، خدا نہیں
۲۔ اس ماہیت کا تعین عمل کے ذریعے ہوتا ہے
۳۔ یہ ماہیت مستقل چیز نہیں بلکہ بدلتی رہتی ہے۔"(۲۵)

حسن عسکری کے مطابق مغربی مفکرین عیسوی دینیات کو یہی سمجھ رہے ہیں اور بعض نوجوان اسلام اور تصوف کی ایسی ہی تفسیر کرنے کو بے قرار ہیں اس کے ساتھ ہی زندگی کی لغویت کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ زندگی جیسی ہے اسے ویسا ہی قبول کر لینا چاہیے اور ایسا کرنے سے انسان اپنی ماہیت کا تعین کر سکتا ہے مغرب کے نوجوانوں میں پھیلے انتشار کی وجہ یہی فلسفہ قرار دیتے ہیں۔
انیس ناگی وجودی فلسفی کے نہ صرف حامی نظر آتے ہیں بلکہ ان کی تحریروں میں بھی وجودی عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انیس ناگی نے زندگی کی لغویت، سیاسی اور سماجی بحران کے عوض پیدا ہونے والے مسائل کو زیر بحث لایا ہے۔ اپنی تحریروں میں کرداروں کے ذریعے وجود کے مسائل اور ماہیت کو بیان کیا ہے انیس ناگی کے ناول وجودی عناصر کی پیشکش کی زندہ مثال ہیں۔ دیوار کے پیچھے ناول میں مرکزی کردار خودکشی کرنا چاہتا ہے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس زندگی کو گزار رہا ہوتا ہے۔ وہ آزادی کے ساتھ جینا چاہتا ہے لیکن معاشرے میں ایسے آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی وہ ایک غیر جمہوری اور منافقانہ معاشرے میں زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔

ایک اور ناول میں اور وہ، میں بھی جمہوریت اور معاشی ناہمواری کو موضوع بنایا گیا ہے معاشرے سے عدم مطابقت کے باعث مرکزی کردار داخلی کرب کا شکار ہو جاتا ہے وہ ماضی اور مستقبل دونوں سے مایوس ہے اسے کوئی امید نظر نہیں آتی اور ہر چیز سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ انیس ناگی کے مطابق :

”وجودیت ایک ایسا نظریہ ہے جس نے بیسویں صدی میں ادب کو سب سے زیادہ متاثر کیا اور اسی کے حوالے سے ادب میں انسان اور اس کی دنیا کو سمجھنے اور اسے اپنے آپ سے مربوط کرنے کا ایک نیا پر سپشن پیدا ہوا ہے۔“ (۲۶)

ریاض احمد فلسفہ وجودیت کے بنیادی عنصر داخلیت کو مانتے ہیں لیکن داخلیت کا مقصد وہ ایسے جہاں کی تخلیق قرار دیتے ہیں جو اقدار سے بنا ہو اور حقیقت پر مبنی ہو اس کے ساتھ وہ سماجی ماحول کو داخلی اور خارجی قرار دیتے ہیں۔ ہم خود سے باہر بھی موجود ہیں اور داخلی ماحول ہمارے ذہن، شعور اور زندگی کا ایک جزو ہے اور اس ماحول میں ایک فرد جو بھی عمل کرے گا اس کا عمل عالمگیر ہے۔

ممتاز احمد وجودیت کے اثباتی اور منفی پہلو دونوں پر روشنی ڈالتے ہیں ان کے مطابق اگر اس کے مثبت پہلو پر غور کیا جائے تو فرد اس کائنات میں کوئی بھی سرگرمی کے آغاز کرنے سے پہلے اپنا وجود رکھتا ہے اور تمام سرگرمیوں کا انحصار اس بات پر ہے۔

” وجود وہ بنیادی حقیقت ہے جس سے باقی تمام چیزوں کے چشمے پھوٹتے ہیں ایک زندگی بسر کرنا سوچنا، عمل کرنا اور ان سے اپنی فطرت کا تعین کرنا جسے جوہر کہا جاتا ہے بہت بعد کی بات ہے۔“ (۲۷)

منفی پہلو کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

” منفی پہلو سے غور کرنے سے یہ دعوی اس خیال کا حامل معلوم کہ انسانی فطرت نام کی کوئی چیز نہیں نہ ہی ایسی کوئی عالمگیر حقیقت ہے جو تمام بنی نوع انسان کا جوہر قرار دی جاسکے۔“ (۲۸)

وجود جوہر پر مقدم ہے اس کو وجودیت کا نقطہ آغاز مانتے ہیں اور اس کو ایک مفروضہ تسلیم کرتے ہیں جو وجودیوں نے آزادی کو بنیاد بنا کر قائم کیا۔ ممتاز احمد فلسفہ وجودیت کو خودکشی کی طرف مائل کرنے والا رویہ سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اگر ہم وجود کو جوہر سے الگ کر دیں تو ایک ایسا خلا جنم لیتا ہے جو صرف خودکشی کے

ذریعے ہی پر ہو سکتا ہے۔اس بات کی وضاحت کی بھی ہے کہ سارتر کا وجود کو جوہر پر مقدم کرنے اور انسانی فطرت سے انکار کرنے کا مقصد صرف آزادی کے لیے بنیادی راہنمائی فراہم کرنا ہے۔ممتاز احمد انسانی فطرت سے انکار کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کے حق میں دلائل یوں پیش کرتے ہیں:

"انسان اپنی حیاتیاتی اور نفسیاتی ہیت اور وظائف میں صرف انسان ہی ہے بندر کتا یا سارتر ہی کے الفاظ میں سٹرابری نہیں، پھر جب تمام انسانوں میں ایک ہی طرح کی نامیاتی اور نفسیاتی ہیئت موجود ہے انہیں دیکھنے، محسوس کرنے، عمل کرنے اور مخصوص انداز میں سوچ بچار کرنے پر ابھارتی ہے کیا یہ انسانی فطرت کے مترادف نہیں؟ "(۲۹)

وجودیت اس انسانی فطرت کو تسلیم کرے تو اس کا یہ دعویٰ ختم ہو جائے گا کہ انسانیت کی کوئی ہمہ گیر فطرت یا جوہر موجود نہیں ہے ۔مشرقی وجودیت میں وجودی عناصر ضرور ملتے ہیں لیکن مغرب کی وجودیت سے کچھ مختلف ہیں مشرق میں انسانی فطرت سے انکار اور نااُمیدی کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔اردو ادب میں مختلف ناقدین کی آراء میں اختلاف کے باوجود اس کے اثرات شاعری ناول اور افسانے پر مرتب ہوئے اردو ادب میں ۶۰ء کی دہائی میں تخلیق کیا جانے والا ادب وجودیت سے متاثر ضرور ہوا۔اس وقت کے ملکی حالات، سائنسی ایجادات نے انسان کو تنہائی اور دہشت کا شکار کر دیا تھا ایسے حالات میں انسان نے اپنے معروض کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ مغرب کی نسبت مشرق میں اس کا کوئی باقاعدہ فلسفی نہیں ہے جس نے وجودیت کا فلسفہ پیش کیا ہو۔ ڈاکٹر وحید اختر اس بارے میں لکھتے ہیں

"اردو کے ادیبوں میں وجودی اور غیر وجودی کا امتیاز کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں کیوں کہ کوئی شاعر، ناولسٹ یا افسانہ نگار اس مکتب فکر کا ہیرو ہے نہ مفسر جدید عہد کے بہت سے شاعر و افسانہ نویسوں اور ناول نگاروں کے یہاں وجودیت کے عناصر منتشر حالت میں مل جائیں گے۔"(۳۰)

۱۹۶۰ء کے بعد اردو افسانے میں خارج سے داخل کی طرف کا رجحان ملتا ہے۔ علامتیں اور تمثیلی انداز میں معاشرے کے ان مسائل کو بیان کیا ہے ہے جن کا اظہار کھلم کھلا نہیں ہو سکتا تھا اس دور کے افسانوں میں

انسان کے ذہنی مسائل، ذات کے کرب، تنہائی کی شدت، خود غرضی اور حسد کو موضوع بنایا گیا۔ اس دور کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے ۔ اس دور کے سیاسی سماجی اور معاشی مسائل کو افسانے میں بیان کیا گیا ہے۔

وجودیت کو آغاز سب سے پہلے کر کے گارڈ کے افکار سے ہوا جو کہ ہیگل کے نظریات کے مخالف تھے۔ ہیگل کا کہنا تھا کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں ایسی ہے جیسے کسی مشین میں چھوٹا پرزہ۔ وجودیت عقلیت پسندی اور مطلیقت کو رد کرتی ہے۔ ان تحریکوں نے انسانی شخصیت کو مسخ کر دیا اور انسان اپنی شناخت کھو بیٹھا۔ وجودیت کے پس منظر میں دو عالمی جنگیں، صنعتی ترقی اور سائنسی ترقی جیسے محرکات نظر آتے ہیں۔ جن کے باعث انسانی اقدار زوال پذیر ہو گئی اور انسانی معاشرے کا نظام بکھر گیا انسان مصروف ترین زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا اور اس کے پاس اپنوں کے لیے وقت بھی نہ رہا۔ اس سے اخلاقی اقدار کو گہری ٹھیس پہنچی۔ دنیا کی اس گہما گہمی نے فرد کی شخصیت کو مسخ کر دیا بے گناہ لوگ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے انسان کی حیثیت صرف ایک حشرات الارض جتنی رہ گئی جنگ عظیم دوم کے بعد اس تحریک نے زور پکڑا جب ہر طرف بم دھماکے، چیخ و پکار اور افرا تفری کا عالم تھا انسان دوسرے انسان کی زندگی سے بیزار رہنے لگا۔

کر کیگارڈ نے کہا جب میں سوچتا ہوں میں ایک عظیم الشان دنیا میں ایک پرزے کی مانند ہو تو میں کانپ ہو جاتا ہوں۔ وہ مذہبی مفکر تھا اس لیے اس نے بحران زدہ شخص کو اپنی شخصیت بحال کرنے کے لئے داخلیت کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دی ہے اس کے خیال میں انسان اپنے داخل کی طرف رجوع کر کے اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتا ہے۔ وجودیت کو ایک قنوطی رویہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ بعض مغربی مفکرین نے اسے یاسیت زدہ کہا ہے۔ اس کے باعث تنہائی، وحشت اور خوف نے جنم لیا۔

تنہائی کے بارے میں وجودی مفکرین کا ماننا ہے کہ انسان کی تنہائی کا کوئی حل موجود نہیں ہے چاہے کیسا ہی معاشرے کا نظام کیوں نہ ہو ان کے ہاں وجودی کرب ملتا ہے۔ وجودیوں کے نزدیک انسان اس وقت کرب میں مبتلا ہوتا ہے وہ جب کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا آیا یہ درست ہے یا غلط۔ کیوں کہ کسی ایک کا فیصلہ عالمگیر ہے اور تمام انسانیت کے لئے ہے۔ اس طرح ہر فرد پر ایک بھاری ذمہ داری عائد ہے۔ اور اگر اس سے درکنار فیصلہ کرتا ہے تو وہ صرف اپنی ذمہ داری سے منہ موڑ رہا ہے۔ وجودیت نے تنہائی، خوف، وحشت، لایعنیت، بے

چار گی، بیگانگی، سائنسی ترقی کو موضوع بنایا ہے۔ دراصل وجودیت نے مسائل سے گھیرے ہوئے انسان کی بات کی ہے۔

وجودیت کی جامع تعریف کرنا مشکل ہے کیونکہ تمام ناقدین کے ہاں آراء میں اختلاف موجود ہے۔ اسے فرد کی ذات سے متعلق کہا جاسکتا ہے مغرب میں اس کے دو رجحان ہیں ایک مذہبی اور دوسرا غیر مذہبی۔ مذہبی وجودی مفکرین میں کرکیگارڈ، جبریل مارسل اور ہائیڈیگر کا نام قابل ذکر ہے۔ مذہبی وجودیت خدا سے انکار نہیں کرتی اور اصلیت پر زیادہ زور دیتی ہے۔ اس کے برعکس غیر مذہبی وجودیت خدا سے انکار کرتی ہے۔ ہائیڈیگر شروع میں مذہبی وجودیت کا حامی تھا لیکن بعد میں غیر مذہبی وجودیت کے ماننے والوں میں شامل ہو گیا۔ جبرئیل مارسل کرکیگارڈ کا شاگرد تھا اس نے کرکیگارڈ کے نظریات کو یکجا کر کے پیش کیا۔

غیر الہیاتی وجودیت کے ماننے والوں میں سارتر نمائندہ موجودیہ مفکر ہے وہ خدا کے وجود سے انکار کرتا ہے اس کا ماننا ہے کہ خدا مر چکا ہے جب اس کا وجود ہی نہیں ہے تو انسان کا جوہر پہلے سے کیسے متعین کرتا ہو سکتا ہے اس کے ان نظریات کے محرکات اس کے ذاتی حالات زندگی بھی ہو سکتے ہیں بچپن میں اس کی والدہ نے اسے چھوڑ دیا وہ جو کے والدہ سے بہت محبت کرتا تھا اس لیے والدہ کے چھوڑ جانے پر اسے شدید صدمہ پہنچا اور دل میں نفرت پیدا ہو گئی وہ دنیا کو بے مقصد تصور کرتا ہے اور انسان کے لئے آزادی کی راہیں ہموار کرتا ہے دوسری بڑی وجہ اس نے لاکھوں لوگوں کو جنگوں میں مرتے دیکھا تھا جہاں سے اس کی سوچ کا زاویہ بدل گیا اس کی تحریروں میں اکتاہٹ اور گھٹن جیسی کیفیات ہیں ان کے کردار متلی کا شکار ہوتے ہیں اور اپنے وجود سے تنگ نظر آتے ہیں۔

البرٹ کامیو کے ہاں قنوطی عناصر باقی تمام وجودی مفکرین سے زیادہ ہیں وہ اس دنیا کے مسائل سے آزادی حاصل کرنے کے لیے خودکشی واحد حل بتاتا ہے۔ کافکا کی تحریروں میں بھی تنہائی اور مایوسی ہے۔ کافکا کے حالات نے اسے اپنی زندگی سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ نفسیاتی کشمکش کا شکار رہتا ہے۔ ساری زندگی اسی کشمکش میں گزار دیتا ہے۔ اسی عالم میں وہ اپنی منگیتر سے کبھی رشتہ جوڑتا ہے اور کبھی توڑ دیتا ہے۔ وہ اس سے شادی کرتا ہے اور بعد میں اسے یہ کہہ کر آزاد کر دیتا ہے کہ وہ تنہا پسند ہے اور تنہا زندگی گزارنا چاہتا ہے ۔ غیر الٰہیاتی مفکرین کا ماننا ہے کہ خدا موجود نہیں ہے اور نہ ہی انسانی فطرت نام کی کوئی چیز موجود ہے۔ وہ ناامیدی اور مایوسی کی طرف زیادہ جھکے نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں دنیا مہمل ہے اس کہ کوئی واضح اصول

وضوابط نہیں ہیں نہ کوئی اخلاقی روایات ہیں انسان جیسے چاہے اس میں زندگی بسر کرے اور جسے چاہے اس دنیا کو شکل دے یہ اپنی کوئی خاص شکل نہیں رکھتی۔

مذہبی وجودی مفکرین وجود کو جوہر پر مقدم قرار دیتے ہیں جبکہ غیر مذہبی وجودی مفکرین کے نزدیک جب خدا نہیں موجود تو جوہر مقدم کیسے ہو سکتا ہے۔ سارتر، کامیو، کافکا، غیر الہیاتی وجودی مفکر ہیں۔ دیگر تحریکوں کی طرح وجود بھی مغرب سے مشرق میں آئی۔ اس میں بعض افکار مشرقی مذہب کے منافی تھے لہذا اسے مکمل قنوطی طور پر نہیں اپنایا گیا۔ اس کے زیر اثر ادب لکھا گیا لیکن اس میں کچھ مشرقی اقدار بھی شامل ہو گئی۔ اردو ادب میں اس کا آغاز ۶۰ء کی دہائی میں دیکھنے کو ملتا ہے جب یہاں کا انسان کرب کا شکار تھا تقسیم کے واقعے کے بعد اور ہجرت کے مارے ہوئے لوگ اندر سے ٹوٹ چکے تھے۔

مشرق میں داخلیت کا عنصر پہلے سے ہی موجود تھا اپنی اصل کی تلاش کے لئے انسان داخلی کیفیات کی طرف راغب ہوتا تھا۔ مشرق میں کوئی باقاعدہ وجودی فلسفی موجود نہیں ہے لیکن ناقدین کے ہاں اس کے چند نظریات موجود ضرور ہیں اور ان میں بھی اختلاف دیکھنے کو ملتا ہے۔ بعض ناقدین اسے قنوطی رویہ کہتے ہیں اور بعض اس کو بحران زدہ انسانوں کے مسائل کا حل مانتے ہیں اس کے باوجود اردو ادب میں وجودیت کی کارفرمائی ملتی ہے۔ ۶۰ء اور ۷۰ء کی دہائی میں پاکستان مختلف تجربات سے گزرا جہاں افسانے میں نئے موضوعات آئے اور افسانہ روایات سے منحرف ہو گیا وہیں اس میں خارجی موضوعات کے ساتھ داخلی کیفیات کو بھی موضوع بنایا جانے لگا۔

۷۰ء کی دہائی میں مارشل لاء اور طرح طرح کی پابندیوں نے صرف خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا۔ ایسے حالات میں انسان کے پاس صرف اس کا داخل ہی ایسی جگہ بچی تھی جہاں وہ رجوع کر کے یہ جان سکے اصل حقیقت کیا ہے۔ اس دور میں لکھے جانے والے ادب میں شعوری یا لاشعوری دونوں صورتوں میں وجودی عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مشرق میں کچھ عناصر ایسے ضرور شامل ہو گئے جنہوں نے وجودیت کو مغربی وجودیت سے الگ کر لیا۔ جن میں ایک تو خدا سے انکار کا تصور یہاں نہیں ملتا دوسرا مایوسی یا اداسی کو گناہ کے مترادف سمجھا جاتا ہے لہذا مشرق میں مایوسی کے بجائے امید کا عنصر غالب نظر آتا ہے جو انسان کو ان مسائل سے نکلنے پر آمادہ کرتا ہے اور اپنی زندگی پھر سے شروع کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔

# حوالہ جات


۱ A.J Guddon, Dictionary of literary terms and theories, penguin Books,London,p36.

۲ Sartre, Jean-Paul, Existentialism and Humanism, Methuen,Londen 1946 ,p16

۳۔ سی۔اے قادر ڈاکٹر،وجودیت، مشمولہ: فلسفہ جدید اور اس کے دبستان، اردو اکیڈمی،لاہور،۱۹۸۱ء ص۱۱۸

۴۔ نعیم احمد،ڈاکٹر، معاصر فکری تحریکیں، مجلس ترقی ادب لاہور،۲۰۱۶ء، ص۷۸

۵۔ ایضاً، ص۷۹

۶۔ علی عباس جلالپوری، روایات فلسفہ، منظور پرنٹنگ پریس، لاہور،۱۹۶۹ء، ص۱۷۰

۷۔ ایضاً، ص۱۶۳

۸۔ ایضاً، ص۱۷۵

۹۔ نعیم احمد،ڈاکٹر، معاصر فکری تحریکیں، ص۸۷

۱۰۔ علی عباس جلالپوری، روایات فلسفہ، ص۱۸۱

۱۱۔ ایضاً، ص۱۷۵

۱۲۔ ایضاً، ص۱۹۴

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ سلطان علی شیدا، وجودیت پر ایک تنقیدی نظر، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ،۱۹۷۸ء، ص۱۴

۱۵۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر، تنقید اور تجزیہ، یونیورسل بکس لاہور،۱۹۸۸ء، ص۹۷

۱۶۔ نعیم احمد،ڈاکٹر، معاصر فکری تحریکیں، ص۷۷

۱۷۔ ایضاً، ص۸۰

۱۸۔ نعیم احمد،ڈاکٹر، معاصر فکری تحریکیں، ص۸۹

۱۹۔ نعیم احمد،ڈاکٹر، معاصر فکری تحریکیں، ص۸۶

۲۰۔ سلطان علی شیدا، ص۳۷

۲۱۔ حمیرا اشفاق، جدیدیت، وجودیت اور اردو ناول، مشمولہ، معیار، شمارہ نمبر ا، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جنوری تا جون ۲۰۰۹ء، ص ۲۶۵

۲۲۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجزیہ، ص ۹۷

۲۳۔ ایضاً، ص ۹۹

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ حسن عسکری، مجموعہ حسن عسکری، عصمت میشن، راولپنڈی، ۱۹۷۹، ص ۹۷

۲۶۔ انیس ناگی، میری ادبی بیاض، جمالیات، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۷۸

۲۷۔ ممتاز احمد، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول ہیت اور اسالیب، رجحانات، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۴۷ء ص ۱۰۱

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ وحید اختر، ڈاکٹر، آگ کا دریا اور وجودیت، مشمولہ، قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۶۷

## باب دوم

# مظہر الاسلام کے منتخب افسانوں کا مطالعہ

## تعارف

مظہر الاسلام کا تعلق خانیوال کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں پیرووال سے ہے ان کے والد محکمہ جنگلات میں تعینات تھے۔ مظہر الاسلام نے بچپن اپنے آبائی شہر وزیر آباد میں گزارا اور مشن ہائی سکول سے میٹرک پاس کیا کچھ عرصہ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں زیر تعلیم رہے مگر پھر والد کی وفات کے بعد ۱۹۶۷ میں مستقل طور پر اسلام آباد میں رہائش اختیا کی۔ اردو ادب میں ایم اے کیا کچھ عرصہ ٹی وی وزارت تعلیم اور ریڈیو سے وابستہ رہنے کے بعد بالا آخر لوک ورثے کے قومی ادارے میں ملازمت اختیار کر لی۔ جہاں وہ بحیثیت ڈائریکٹر اور ایگزیکٹو ڈائریکٹر خدمات انجام دے رہے تھے وہ پاکستانی اکیڈمی آف لیٹرز سے بحیثیت ڈاکٹر جنرل بھی وابستہ رہے

انہیں ادب کا پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ دیا گیا ہے مظہر اسلام نے ٦٠ ء کی دہائی کے قریب افسانہ نگاری کا آغاز کیا مظہر الاسلام نے اپنے افسانوں کے ذریعے اپنی داخلی اور انفرادی زندگی کی کیفیات اور تجربات کو سامنے لایا ہے۔ گمشدہ نسل کا پورٹریٹ میں لکھا ہے

> ”میری ماں اور باپ دونوں میرے جس کے ہرا ہونے سے قبل
> میرے جسم سے علیحدگی کا اعلان کر چکے تھے میں نے علیحدگی
> کا مشترکہ اعلامیہ کئی بار پڑا لیکن اس میں علیدگی کی کوئی وجہ
> بیان نہیں کی گئی تھی میں نے مروڑ کر کاغذ جیب میں رکھ لیا اور
> اندر آکر دروازہ بند کر لیا۔“(۱)

ڈاکٹر صفیہ عباد اس حوالے سے لکھتی ہیں :

”مظہر الاسلام کی ابتدائی زندگی مختلف حوالوں سے انہی مختلف

کھونٹیوں سے بندھی ہوئی نظر آتی ہے ان کی کہانی میں یہ تمام
ذائقے کھلتے نظر آتے ہیں۔"(۲)

مظہر الاسلام کی افسانہ نگاری کا دائرہ صرف اپنی ذاتی زندگی تک محدود نہیں رہا بلکہ اپنے اردگرد کے حالات کو بھی اپنی کہانی کا حصہ بنادیا زندگی کے اصل حقائق اور انسانی قدروں کو دیکھنا اور دوڑنا شروع کر دیا مگر اسلام کی چند مشہور تصانیف ہیں جن میں گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو، خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر اور ناول محبت مردہ پھولوں کی سمفنی شامل ہیں۔

## الف۔ مظہر الاسلام کے افسانے میں رجائی وجودی عناصر

مظہر الاسلام ساٹھ کی دہائی کے افسانہ نگار ہیں جب افسانے میں نئے موضوعات درآئے۔ علامتی افسانے کا آغاز ہو چکا تھا ملک کے سیاسی و سماجی حالات زوال پذیر تھے ملک میں کشمکش کی صورتحال تھی اس کے ساتھ ہی مارشل لاء اور اظہار بیاں پر بھی پابندی عائد تھی۔ مظہر الاسلام نے ۱۹۶۵ء کے بعد افسانے لکھنے شروع کیے انہوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرے کے حالات، سیاسی و معاشی ابتری کو علامتی اور استعاراتی انداز میں بیان کیا۔ مظہر الاسلام کے ہاں علامتوں کا انوکھا استعمال ملتا ہے گہری معنویت کی حامل علامتوں کا استعمال کیا ہے اور علامتی انداز میں پُر زور احتجاج کیا ہے۔ اسی دہائی میں وجودیت کی تحریک بھی اردو ادب میں آئی۔ وجودیت فرد کے مسائل کے متعلقہ تھی اور داخلیت کی طرف مائل کرنے والی تحریک تھی وجودیت کے پس پردہ محرکات کے تجزیہ کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تقریباً ویسے ہی حالات سے ملک پاکستان بھی دوچار تھا۔ ادیبوں نے اندروں شہر کے مسائل کو ادب میں جگہ دی۔ ادیب چونکہ معاشرے کا ایک حساس شخص ہوتا ہے اور معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ اور ان حقائق کو قاری کے سامنے لاتا ہے جو کہ اس کی آنکھ سے اوجھل ہوتے ہیں۔ مظہر الاسلام کے افسانوں میں اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی ملتی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی

"مظہر الاسلام ایسے نئے لکھنے والوں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اُن کے افسانے نئ

جہت، نئے رنگ اور نئے تجربے کا پتا دیتے ہیں۔ مظہر الاسلام کی کہانیوں کا ابہام، ان کی طلسماتی فضا اور عجیب و غریب واقعات بظاہر زندگی سے دور معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل یہ زندگی کی وہ سچائیاں اور حقیقتیں ہیں جنہیں ہم ذرا سی توجہ سے پہچان لیتے ہیں۔"(۳)

مظہر الاسلام نے جس دور میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا اس دور میں اردو ادب میں وجودیت کی تحریک ظہور پذیر ہوئی۔ کیونکہ یہ فرد کی ذات اور اس کے مسائل کے متعلق ہے اور اس وقت کے ملکی حالات نے انسان کو عدم تحفظ کا شکار کر دیا تھا۔ ایسے میں فرد کو اجتماع سے کٹ کر اپنی ذات کی طرف توجہ دلانے میں وجودیت کا اہم کردار ہے۔ مظہر الاسلام کے افسانوں میں وجودی عناصر کی کارفرمائی ملتی ہے ان کے افسانے ایسے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو اندر سے ٹوٹ چکے تھے۔ افسانہ اپنا مواد معاشرے سے لیتا ہے لہٰذا شعوری یا غیر شعوری طور پر جن چیزوں نے مظہر الاسلام کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی وہ ان کی تحریروں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر صفیہ عباد: "مظہر الاسلام کے افسانوں کے موضوعات تنہائی، جدائی، مایوسی، کرب، گھٹن، محبت، خود غرضی جیسے ہیں۔"(۴) انیس سو پینسٹھ کی جنگ، ملک کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا اور مارشل لاء کا دور یہ ایسے عناصر تھے جنہوں نے فرد کے اندر اپنی شناخت کا مسئلہ پیدا کیا اور اسے داخل کی طرف رجوع کیا۔ مظہر الاسلام نے ان موضوعات کو اپنی کہانیوں کے ذریعے علامتی انداز میں پیش کیا۔

مظہر الاسلام کھوئی ہوئی اقدار کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ انسانیت کا مسخ ہو جانا، ہر طرف منافقت اور خود غرضی کا عام ہونا جس کی وجہ سے خوف اور وحشت پیدا ہوتی ہے وہ زندگی میں موجود ہر چیز کو کہانی کا حصہ بنا دیتے ہیں۔ مظہر الاسلام نے اپنے افسانوں میں اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی ابتری کو موضوع بنایا ہے۔ ان حالات نے فرد کو جن مسائل سے دوچار کیا وہ کی کہانیوں کا کردار بن گئے۔ مظہر الاسلام کے افسانوں میں تنہائی، مایوسی، زندگی کی لغویت کے ساتھ چند عناصر مثبت نظر آتے ہیں۔ زندگی کے چند رویوں میں وہ پُر امید نظر آتے ہیں۔ سماج کے منفی رویوں پر کڑی تنقید کرتے ہیں یہ بات بجا ہے ان کے کردار زندگی کے بوجھ سے تنگ ہیں اور ہجوم سے دور رہنا پسند کرتے ہیں۔ خود کو تنہائی میں پر سکون محسوس کرتے ہیں۔ مظہر الاسلام کے افسانوں میں رجائی عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ریاض احمد کے مطابق وجودیت ایک مایوسی کا رویہ ہے

لیکن مشرق میں کچھ عناصر ایسے دیکھنے کو ملتے ہیں جو اسے یکسر قنوطی ہونے سے بچاتے ہیں۔ذیل میں رجائی وجودی عناصر کے تناظر میں مظہر الاسلام کے منتخب افسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

## اجتماعی احساس

مغربی وجودیت میں اجتماع یا کسی گروہ میں زندگی گزارنے سے فرد کی شخصیت مسخ ہونے کا نظریہ ہے اس طرح فرد اپنی انفرادیت کھو دیتا ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ انسان تنہا ہے اور کوئی نظام اس کا حل نہیں ہے۔ مظہر الاسلام اگرچہ تنہائی پسند نظر آتے ہیں لیکن وہ زندگی کی تلخیوں کو اجتماعی طور پر بھی محسوس کرتے ہیں اور معاشرے کی مسائل کو وہ اجتماعی طور پر حل بھی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی ذات تک سختیوں سے پریشان ہیں بلکہ سماج میں رہنے والے ان تمام لوگوں کے لئے پریشان ہیں جو ان کڑی آزمائشوں سے گزر رہے ہیں۔ وہ ایک پر امن اور بدعنوانیوں سے پاک پر امن ماحول میں زندگی گزارنے کے متمنی نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک معاشرے میں پھیلی اجتماعی خرابیاں اور کمزوریاں اس معاشرے کو کھوکھلا کر رہی ہیں۔ اس طرح معاشرے میں مذہبی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی اقدار زوال کا شکار ہو رہی ہیں۔ معاشرے کے لوگوں میں منافقت اور خوشامد جیسی بری لعنت پھیل رہی ہے جس کو وہ شدت سے محسوس کر رہے ہیں اور اس پر شدید تنقید کرتے ہیں۔ یہی اجتماعی احساس ان کے افسانوں کو مکمل طور پر قنوطی ہونے سے بچاتا ہے۔

افسانہ متروک آدمی، ایک ایسے ہی شخص کی کہانی ہے جو کہ دوسروں کے درد کو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار کا کوئی نام نہیں ہے۔ بوڑھا شخص ہے جو کہ اپنے ساتھ گاڑی میں سوار دوسرے شخص کی گٹھڑی کے لیے پریشان ہے جو اس نے گاڑی کی چھت پر رکھوادی ہے۔ بوڑھا اس حد تک مخلص ہے کہ وہ اسی پریشانی کے عالم میں ہوتا ہی ہے کہ گاڑی سے ہی اتار دیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر معاشرے کے ان لوگوں پر طنز ہے جو کہ احساس زیاں سے محروم ہیں اور خود غرضی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انسان بیگانگی کے عالم میں اپنی زندگی میں اس قدر مشغول ہو گیا کہ اسے اپنی زندگی کی پریشانیوں سے ہی فرصت نہ تھی تو معاشرے کی برائیوں کی اصلاح کیسے سوچتا۔ معاشرے میں صرف چند ہی افراد ایسے تھے جن کو اجتماعی طور پر اصلاح کی فکر تھی۔ بوڑھا آدمی معاشرے کے ان حساس لوگوں میں سے ہے جو دوسروں کے دکھ درد سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور دوسروں کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھتا ہے۔ مرکزی کردار اجتماعی

احساس رکھتا ہے۔اس کو گٹھڑی کے گرنے کا امکان چین سے بیٹھنے نہیں دیتا اور گاڑی تیز چلانے پر ڈرائیور پر چیختا ہے۔ گاڑی میں سوار بوڑھا شخص گٹھڑی کے مالک کو اپنے نقصان سے بیگانہ دیکھ کر شدید غصے کا شکار ہوتا ہے، وہ کہتا ہے:

"الو کا پٹھا تماش بین بنا بیٹھا ہے اور گٹھڑی کی کوئی فکر کی نہیں۔اس کی
ماں چھت سے گر جائے گی تو پتا چلے گا ہو سکتا ہے اسے احساس نہ ہو کہ
گٹھڑی گر بھی سکتی ہے۔ یہ سوچ کر اس نے کندھا ہلایا اور پوچھا، اوپر
گٹھڑی تمہاری ہے، ہاں میری ہے گٹھڑی کے مالک نے کندھے جھٹک
کر کہا اور پھر سگریٹ پینے میں محو ہو گیا۔"(۵)

بوڑھا دور اندیش اور معاشرے کا تجربہ کار شخص ہے جو آنے والے خدشات سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے لیکن اپنے نقصان سے بے خبر لوگ اپنی ہی دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں اور برے وقت کے ہاتھوں ہونے والے نقصان سے بے خبر ہوتے ہیں گٹھڑی گرنے کی فکر بوڑھے کو کھائے جا رہی ہے جب کہ گٹھڑی کا مالک سکون سے سفر کر رہا تھا لیکن اس احساس کا نتیجہ بوڑھے کو کچھ اس طرح ملتا ہے:

"اچانک ویگن تیز ہو گئی وہ لال پیلا ہو کر چیخا۔ آہستہ چلاؤ آہستہ،
تم سنتے کیوں نہیں گٹھڑی پھر گر پڑے گی۔ڈرائیور نے ویگن
روک دی اور کنڈیکٹر کی طرف سے دیکھ کر بولا گٹھڑی گٹھڑی کی
رٹ لگا رکھی ہے اس نے، واپس کر دو کرایہ اس کا اور اتارو نیچے
اسے، گٹھڑی کسی کی ہے اور یہ خواہ مخواہ گٹھڑی کا ماما بنا ہوا ہے۔"(۶)

یہ کہانی معاشرے کے اس رویے پر طنز ہے جو کہ اخلاق سے عاری ہو چکا تھا اور اصلاح پسندوں کو اسی طرح دھتکارا جاتا تھا جیسے گاڑی سے اتارا ہوا شخص تھا۔ افسانہ سانپ گھر، میں بھی اجتماعی احساس دیکھنے کو ملتا ہے افسانے کا مرکزی کردار جو کہ ایک دفتر میں ملازم ہوتا ہے اسے ہر جگہ سانپ دکھائی دیتے ہیں وہ جہاں جاتا ہے سانپوں کی پھنکار اس کے ساتھ جاتی ہے۔ سانپ کو انسان کا دشمن سمجھا جاتا ہے اور اس کا زہر اس قدر

خطرناک ہوتا ہے کہ آدمی کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ انسان دشمنی کا زہر جو معاشرے کی رگوں تک اتر چکا تھا علامتی انداز میں اس پر تنقید ہے جو کہ بد اخلاقی کی انتہا کو چھو رہا ہے۔ مذکورہ افسانے کا مرکزی کردار ایک دوسرے کو دھوکہ دینے۔ دوسروں کا حق مارنے اور خوشامد، رشوت جیسی بیماریوں کو لے کر سخت پریشان ہے کہ اس بیمار اور زوال آشکار معاشرے کو کیسے بچایا جا سکتا ہے۔ وہ ایک خوشحال معاشرے کا خواہش مند ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مخلص زندگی گزاریں۔ منافقت اور خوشامد نے معاشرے کو آہستہ آہستہ تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ وہ منافق لوگوں کے اس رویے سے پریشان ہے کہ جنہوں نے معاشرے میں منافقت اور رشوت کو فروغ دیا ہے۔ وہ اصلاح پسند ہے

"کبھی کبھی اس کا جی چاہتا ہے وہ سارے شہر کو جڑ سے اکھاڑ کر الٹا کر دے تا کہ جب
سارے سانپ نیچے گر جائیں تو پھر سے شہر کو سیدھا کر کے اپنی جگہ پر لگا دے۔"(۷)

منافق لوگوں کے دہرے رویے پر کڑھتا ہے۔ ان کا دو منہ والے سانپ کہتا ہے جس سے بچنا ناممکن ہے۔ شہر میں خوشامد اس قدر پھیل چکی تھی کہ معمولی سی ملازمت کے لیے بھی رشوت اور خوشامد کا سہارا لینا پڑتا تھا وہ دونوں والے سانپ کے بارے میں بتاتا ہے: "دو منہ والے سانپ کے ڈسنے سے انسان ایک دم نہیں مرتا بلکہ آہستہ آہستہ اور گھل گھل کر جان دیتا ہے۔"(۸) تنزلی کے شکار اس معاشرے کو یہ بیماریاں کھو کھلا کر رہی تھی ان کے باعث معاشرہ اک دن دم توڑ دے گا۔ انسان نے جب انفرادی زندگی کو اہمیت دی تو معاشرے سے کٹ گیا انسان مادی ضروریات کو پوری کرنے کے لیے انسانیت پست درجے تک گر گئی۔ اخلاقی اقدار کے زوال پر مظہر الاسلام نے کڑی تنقید کی ہے مذکورہ افسانے کا کردار سماج میں پھیلے اس نفرت سے پریشان ہے۔ "یہ سانپ کی لوگوں کو ڈستا ہو گا اور انہیں پتہ بھی نہیں چلتا ہو گا اس طرح تو ان کی عمریں گھٹ جائیں گی اور ان کا خون زہریلا ہو جائے گا۔"(۹) مظہر الاسلام نے عوام کی بے حسی کو موضوع بنایا ہے۔ وہ لوگوں سے ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت پر ختم ہونے پر نوحہ کنعاں ہے۔

"کل بس میں دو آدمی معمولی بات پر جھگڑ پڑے مسئلہ سیٹ کا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے
کو ماں بہن کی گالیاں دیں اور پھر مکا بازی شروع ہو گی۔ میں حیران تھا کہ اتنی معمولی سی
بات پر وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ اب سمجھا میرے خیال میں ان کا خون بھی زہریلا ہو چکا

تھا انہیں سانپ ضرور ڈستا ہو گا۔"[10]

مظہر الاسلام دراصل انسانیت کے پست درجے تک گرنے پر پریشان ہیں۔ ادیب چونکہ معاشرے کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور ان پر تنقید کرتا ہے۔ مظہر الاسلام بھی اپنے معاشرے کا احساس ایک افسانہ نگار ہیں جنہوں نے سماج میں پھیلی برائیوں پر کڑی تنقید کی ہے اور ان کی اصلاح بھی چاہتے ہیں۔

افسانہ تن لیر اں لیر اں بھی اجتماعی احساس کی مثال ہے اس افسانے میں اندروں شہر کے حالات کو بیان کیا ہے لوگوں کے دکھ اور غموں کو کچرے کا ڈھیر تصور کرتے ہیں۔ مرکزی کردار بے نام لڑکی ہے جو سارا دن کچرے کے ڈھیر سے لیر اں اکٹھی کرتی ہے اور شام کو گھر لوٹتی ہے لیر اں اکٹھا کرنا اس کا معمول ہے۔، اس لڑکی کے دل میں بھی اجتماعی احساس ہے۔ وہ اپنے شہر کے تمام ٹوٹی ہوئی چیزوں کو اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔ شہر کے لوگوں کی ٹوٹی اور بکھری ہوئی خواہشات کو سمیٹتی ہے۔

"یہ کوڑا نہیں ہے یہ تو ٹوٹے ہوئے شہر کا ملبہ ہے۔ میں یادیں چنتی ہوں، گند اکھٹا کرتی ہوں، آوازیں جمع کرتی ہوں اور شام ہونے تک ٹوٹا ہوا شہر پھر سے جوڑ دیتی ہوں مگر شام پڑے جب میں اپنی جھگی میں جا کر سوتی ہوں تو دھڑام سے سارا شہر پھر ڈھیر ہو جاتا ہے اور میں صبح اٹھ کر پھر سے شہر کو جوڑنا شروع کر دیتی ہوں۔"[11]

ہر اسمندر، بھی اجتماعی احساس کی مثال ہے مرکزی کردار کو طرح طرح کے خیالات نے گھیر اہو تا ہے بارش ہونے کی صورت میں اسے اپنے ارد گرد رہتے تمام لوگوں کی فکر ہے۔ جو اس بات کا غماز ہے کہ سماج میں انسان تن تنہا زندگی نہیں گزار سکتا بلکہ زندہ رہنے کے لیے دوسرے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ بارش کے موسم میں میں دوسروں کی چھت پر رکھے ہوئے کپڑوں کے لیے پریشان رہتا ہے۔

"بارش لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اسے خیال آیا کہ بہت سے کچے مکان اس بارش میں بہہ جائیں گے معاً اسے اپنے محلے کے حلوائی کے بنچ کا خیال آیا جو اس کی دکان کے سامنے پڑا تھا۔ اسے یوں لگا

جیسے وہ حلوائی کی دکان کے سامنے پہنچ گیا ہے اور اس کا بنچ اٹھا کر تھڑے پر رکھ رہا ہے ایک دکان کے سامنے خالی بوریاں پڑی تھیں۔ اس نے انہیں اٹھا کر چھپر کے نیچے رکھ دیا۔ بازار سنسان پڑا تھا اور بارش کی گہما گہمی تھی۔ دکانوں کے دروازے بند تھے اور ان کے مالک گھروں میں سو رہے تھے۔ اسے لگا جیسے سب دکانیں اندر سے ٹپک رہی ہیں۔"(۱۴)

شہر میں پھیلی نفرتوں پر بھی طنز ہے افسانے کا ایک کردار جو بے نام ہے وہ کہانی کو بیان کرتا ہے وہ کوڑھے کے ڈھیر کے بارے میں بتاتا ہے کوڑے سے شہر کی محبتوں اور نفرتوں کی مہک آرہی تھی۔ سیاسی کشمکش کے باعث ملک میں پھیلی ہوئی پیدا ہوئی غربت اور کمزور لوگوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کو مظہر الاسلام نے۔ اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے وہ سماج میں رہنے والے تمام لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک کرنے اور عزت واحترام دینے کے قائل ہیں۔ یہ کہانیاں دراصل ان لوگوں کی ہیں جو اندرونی طور بکھر چکے تھے۔ طبقاتی نظام، حکمرانوں کی طرف سے عائد کردہ سختیاں اور ظلم وستم کے خلاف احتجاج ہے۔ مظہر الاسلام ان مظالم کو اجتماعی طور محسوس کرتے ہیں اور اصلاح کے خواہش مند بھی ہیں۔

## صداقت / داخلیت

داخلیت کا عنصر مذہبی وجودیت میں ملتا ہے کرکیگارڈ ایک مذہبی وجودی مفکر تھا جس کے مطابق انسان اپنی اصل تک پہنچنے کے لیے داخل کا رجوع کرئے۔ مظہر الاسلام کی کہانیوں میں بھی خارجی اور داخلی سطح پر سچائی کی تلاش نظر آتی ہے۔ خارجی سچائی غربت میں ہے، بھوک، پیاس میں ہے۔ انسان کے عارضی ہونے کی دلیل غربت میں بسر ہونے والی زندگی ہی بتا سکتی ہے اس کے برعکس انسان کے اندر کی سچائی عبادتوں اور ریاضتوں کی متقاضی ہے اس کے لیے کٹھن راستوں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے کئی مشقتیں اور اذیتیں اٹھانی پڑتی ہیں تب جا کر انسان داخلی سچائی تک رسائی حاصل کرتا ہے مظہر الاسلام سچائی کے متلاشی کہانی نویس ہیں وہ ظاہری حقیقتوں کی کے علاوہ داخلی سچائی کی بات کرتے ہیں اکثر کردار اپنی تلاش میں محو رہتے ہیں۔ وہ اپنے حال میں مست اور بے خود نظر آتے ہیں۔ صنعتی ترقی نے انسان کو مشینی غلام بنایا تو وہ اپنی شناخت کھو بیٹھا۔ دنیا کے ہنگامے نے انسان کو اس قدر مشغول کر دیا کہ وہ اپنی قریبی رشتوں سے بھی ناآشنا ہو گیا۔ روزانہ کی چہل پہل نے اسے بھی ایک مشین بنا دیا جو سارا دن کاموں میں مشغول ہو تا مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے طرح

طرح کی مشقتیں اٹھانی پڑتی اس کے برعکس انسان کے نزدیک دوسرے انسان کی حیثیت ایک کیڑے مکوڑے جتنی ہوگئی کئی لوگ لقمہ اجل بن گئے۔ ان حالات میں مظہر اسلام نے اپنی شناخت کے لئے داخل کی طرف رجوع کیا جس کا ذکر کرکیگارڈ کے ہاں بھی ملتا ہے جو مذہبی وجودی مفکر تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ انسان اپنے داخل کی کی طرف رجوع کرکے اپنے وجود کے مسائل کا حل نکال سکتا ہے۔ مظہر الاسلام کے کچھ افسانوں میں بھی یہی رجحان ملتا ہے۔ کہیں وہ کسی مزار پر اور کہیں کسی میلے میں اپنے اندر سے آنے والی آوازوں کو سنتا ہے داخلیت کو مظہر الاسلام کی کہانیوں پر غالب تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس سے درکنار نہیں کہا جا سکتا۔ افسانہ می رقصم، ایک کہانی ہے جس میں مرکزی کردار کسی مزار پر بیٹھا ہے وہ بے خودی کے عالم میں داخلی سچائی کا متلاشی ہے۔

"سلوک کی بارش لگی ہوئی تھی۔ آس کا کشکول من دروازے پر لٹکا ہوا تھا
اور سارے تن سے معرفت کے رنگ نچڑ رہے تھے۔ ساری کائنات اللہ ہو،
کی آوازوں سمندر میں ڈوب چلی تھی اور اس کا وجود می رقصم کی انی پر ناچ
رہا تھا۔"(۱۳)

وہ عشق کی انتہا تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں وہ جان سکے کہ وہ کیا ہے؟ وہ اپنی ذات کی تلاش میں تھا۔ مرکزی کردار اس بات کا خود اعتراف کرتا ہے: "میں کب سے تلاش میں ہوں ابھی چھوٹا سا تھا کہ ایک دن میرا باپ مجھے داتا دربار لے گیا تھا وہاں میں گم ہو گیا تھا۔"(۱۴) وہ خود کو فقیروں ملنگوں میں تلاش کرتا ہے کبھی مزار پر بیٹھے کبوتروں میں اسے اپنا دکھائی دیتا ہے۔ وہ مست، بے خود فقیر ہے۔ جس سے باہر کی دنیا سے کوئی لینا دینا نہیں۔ وہ صرف اپنی تلاش میں مست ہے اور اپنے اندر کی دنیا میں مگن ہے۔ معرفت حاصل کرنے کے لیے کڑی آزمائشوں سے گزرتا ہے، نفس کی خواہشات کو جلاتا ہے: "بکل سے آواز آئی ہے یہ نفس ہے ہر وقت بھونکتا رہتا ہے ڈرو نہیں اسے یقین کا پتھر مارو بھاگ جائے گا۔"(۱۵) وہ اپنا آپ ساری خواہشوں سے خالی کر دیتا ہے اپنی انا کو مار دیتا ہے۔ خود سے میں کو ختم کر کے ہی معرفت کا راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور اس نے ایسا ہی کیا وہ خود کو تمام خواہشوں سے خالی محسوس کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو چوری کیا جا سکے سوائے اس کے کہ اندر طلب کی پیاس ہے۔

کہانی سے باہر گرا ہوا بابا، بھی عرفان ذات حاصل کرنا چاہتا ہے۔اس کے ساتھ ہی ایک جوان بھی اپنے من کے ادھڑنے کی شکایت کرتا ہے وہ رفو کرنے کے باوجود بھی ادھڑ جاتا ہے۔انسان جب معرفت کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کرتا ہے تو من میں لگی اس آگ کو چاہے بھی تو نہیں بجا سکتا اس پیاس کی طلب بڑھتی ہی جاتی ہے ۔بابا ساتھ چلتے ہوئے نوجوان سے مخاطب ہے: ''یہ کبھی بھی رفو نہیں ہو گا جتنا رفو کرو گے اتنا ہی ادھر جائے گا۔''(۱۶) وہ ایسے سفر پر رواں ہے جو نہ ختم ہونے والا ہے۔اس کے نزدیک اصل سچائی وہی ہے جو کٹھن مشکلات کے بعد حاصل ہو۔ ''سچا سفر وہی ہے جو پیدل چل کر دیا جائے۔''(۱۷) سچائی تک پہنچنے کے لیے کڑی آزمائش سے گزرنا ضروری ہے۔انسان جن تجربوں سے اپنے آپ کو گزارتا ہے انہی کے ذریعے وہ اصل حقیقت تک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اپنی ذات کی سچائی سے آشنا ہونے کے لئے بابا تنہائی کی تلاش میں ہوتا ہے۔ تنہائی ہی اصل راستہ ہے جو ایک سچے عاشق کو اپنی منزل تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے۔بابا بھی ہجوم سے زیادہ خود کو تنہائی میں پر سکون محسوس کرتا ہے۔

> ''میں اپنے آپ سے ڈرتا ہوں جب دن چڑھتا ہے اور شہر لوگوں سے بھر جاتا ہے تو ہجوم میں اپنے آپ سے اور زیادہ ڈرنے لگتا ہوں۔ لیکن جوں ہی اندھیرا دن کی دہلیز میں پر قدم رکھتا ہے یہ ڈر کم ہونے لگتا ہے جب میں اکیلا ہو جاتا ہوں تو مجھے اپنے آپ سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔''(۱۸)

بابا کا ہمسفر نوجوان بھی اس تنہائی کا ذکر کرتا ہے: ''بابا میں تنہائی کی بھوک کاٹتا ہوں لمبی بھوک ،بولا یہ اچھی بات ہے۔ تنہائی کی بھوک کے بعد جب کوئی ملتا ہے تو بس کچھ نہ پوچھو۔''(۱۹) انسان کی روح کو اس وقت ہی سکون ملتا ہے جب وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے اور عاشق کو جب اپنی معرفت حاصل ہوتی ہے تو تب ہی اسے سکون آتا ہے۔افسانہ رات، بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے جس میں دو کردار اپنی ہی ذات میں بے خود دکھائی دیتے ہیں اور وہ اپنی تلاش میں ہیں۔ساری رات رحمتوں کا نزول ہوتا ہے وہ اس رات کو نجات کا ذریعہ بناتے ہیں۔ان کی زندگی بیل گاڑی کی طرح ہے جس پر کوئی بیٹھا ہوا تو ہیں ہے لیکن پھر بھی وہ اس کو ہانکنے پر مجبور ہیں۔وہ دھمال ڈالتے ہیں۔

"وہ اٹھے اور بے خود ہو کر ناچنے لگے اللہ ہو، اللہ ہو، توبہ، توبہ استغفار توبہ۔
وہ اپنے من توبہ کے صابن سے مل مل کر دھونے لگے۔ ان کے جسم کے
چیتھڑے چیتھڑے ہو کر بکھر گئے۔"(۲۰)

وہ بے خودی کے عالم میں اپنی پہچان بھول جاتے ہیں اور دونوں یک زبان ہو کر کہتے ہیں: "ہم کوئی بھی نہیں اور پھر مستی کے عالم میں ناچنا شروع کر دیتے ہیں اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو۔(۲۱) وہ مستی کے عالم میں ناچتے رقص کرتے اور اللہ ہو کی صدائیں بلند کرتے ہیں اور اپنے اعمال صاف کرتے ہیں۔ مظہر الاسلام داخل کی سچائی کو روح کے اندر تلاش کرتے ہیں وہ سلوک کو روح کا عروسی جوڑا کہتے ہیں۔اس سچائی کی تلاش میں کبھی وہ لال شہباز قلندر کے دربار پر نظر آتے ہیں کبھی بابا فرید کے مزار کے فرش پر اس سچ کی خاطر وہ لمبی ریاضتوں کا راستہ چنتے ہیں۔خارجی یا مادی وجود کا انکار ان کی روح کرتی ہے روح جب مستی سے سرشار ہوتی ہے تو خارجی خول کے چیتھڑے اڑ جاتے ہیں۔دراصل وہ داخلی سچائی کے ذریعے اپنی حقیقت سے آشنا ہونا چاہتے ہیں

### آزادی

وجودی مفکرین کے نزدیک انسان اس دنیا میں آزاد پیدا ہوا ہے اور اپنے تمام تر اعمال کا ذمہ دار خود ہے اس دنیا میں رہتے ہوئے انسان کوئی بھی فعل سرانجام دیتا ہے تو اس کے کے نتائج کا ذمہ دار بھی خود ہے وہ انفرادی زندگی کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ مذہبی وجودی مفکرین کے خیال میں انسان جب کوئی فعل سرانجام دے رہا ہوتا ہے تو وہ صرف اپنے لئے نہیں ہوتا بلکہ پوری بنی نوع انسان کے لئے ہوتا ہے۔مظہر الاسلام کے ہاں آزادی کا عنصر مذہبی وجودیت سے قریب تر معلوم ہوتا ہے جس میں وہ اجتماعی طور پر ذمہ داری کا احساس رکھتے ہیں اور ایسے راستے کا انتخاب کرتے ہیں جو دوسروں کے لئے بھی مشعل راہ ثابت ہو۔اس کے برعکس غیر مذہبی وجودی آزادی کا عنصر بھی کہیں کہیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس میں وہ اس بات پر تنقید کرتے ہی کہ شہری اپنے فیصلے کرنے کے لئے آزاد نہیں ہیں ان کے فیصلے بھی کوئی دوسرا عائد کرتا ہے۔ غیر الہیاتی وجودیت بھی اس بات پر متفق ہے کہ انسان اگر آزاد پیدا ہوا ہے تو وہ اپنے ہر فعل کا ذمہ دار خود ہے۔اس ضمن میں افسانہ لائین میں شہر کی شکایت کس سے کرے، قابل ذکر ہے لائن مین شہر میں پھیلے غیر اخلاقی رویوں پر طنز کرتا ہے وہ اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے اور لوگوں کے رویوں کے بارے میں اپنی ماں سے شکایت کرتا ہے۔

"ماں لوگوں میں معاف کر دینے اور اور درگزر کر دینے کا جذبہ مر گیا ہے۔وہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بڑی سے بڑی سزا تجویز کرنے کی عادی ہوگئے ہیں وہ سختی پسند کرنے لگے ہیں اب تو وہ اپنے فیصلے بھی خود نہیں کر پاتے ان کی خواہش بھی کوئی دوسرا متعین کرتا ہے وہ جھوٹی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں اور سچی باتوں کو جھوٹی سمجھتے ہیں ماں نے بات بدلنے کے لیے کہا چل تو اپنے کام سے کام رکھ کھمبے پر چڑھ کر صرف بجلی ٹھیک کیا کر شہر کو نہ دیکھا کر۔"[۲۲]

مظہر الاسلام آزادی پسند ہیں وہ آمرانہ نظام سے ہو، کسی طاقتور سے کمزور کی آزادی ہو، یا اپنے وطن کی آزادی ہو اس کے لئے جدوجہد کرتے دکھائی دیتے ہیں ہیں اگرچہ وہ زوال آشکار وطن کے باسی ہیں جو بے شمار بیماریوں کا شکار ہے اس کے باوجود اسے ترک کرنے کا خیال کبھی نہیں آیا وہ کہتے ہیں جس طرح بیماری میں مریض کو نہیں چھوڑا جا سکتا اسی طرح اپنے وطن اور اس میں رہنے والے لوگوں کو کو مصیبت میں چھوڑ کر نہیں جایا جا سکتا ایک سچے محب وطن ہونے ہیں۔زمین کا اغوا اور روئی کے بادبان، دونوں اپنی مٹی سے محبت اور آزادی کی خاطر جدوجہد کی مثال ہیں اور وطن کی حفاظت اولین فرض سمجھتے ہیں۔ مظہر الاسلام افسانہ زمین کے اغوا میں وصیت کرتے ہیں: "یاد رکھ پتھر کی یہ سب چیزیں اس لیے حنوط کر دی گئی ہیں کہ انہوں نے اپنی زمین کی حفاظت کرنے سے انکار کر دیا تھ۔"[۲۳] مذکورہ بالا کہانی کا کردار اپنی بیٹوں کو متحد رہنے اور مل کر رہنے کی تلقین کرتا ہے اور اپنی حفاظت زمینوں کی حفاظت کے لیے کہتا ہے:

"یہ مسافر کی پشتوں سے ہماری زمینیں چھیننے کی کوشش کر رہا ہے۔یہ ہمارے آباء واجداد کو زیر کرنے آیا تھا پہلے تو یہ دھوکہ سے کام لیتا تھا۔ لیکن اب وہ تم میں سے ہر ایک کے پاس آئے گا تم سب مل کر رہنا چھوٹے بڑے کی تمیز میں نہ الجھنا، تم میں سے کوئی زیادہ دولت مند اور چھوٹا بڑا نہیں، تم سب ایک جیسے ہو اس وقت تک غفلت نہ کرو جب تک کہ مسافر تمہارے علاقے سے نکل نہیں جاتا۔"[۲۴]

روئی کے بادبان ان نوجوانوں کی کہانی ہے جو اپنے ملک کی خاطر جنگ کرنے جاتے ہیں اور شہید ہو جاتے ہیں جس میں جنگ پر جانے والے جوانوں کو ملکی فوج لے جاتی ہے لیکن ان سے جانے کی رضامندی نہیں

پوچھی جاتی بلکہ آمرانہ نظام کے تحت ان پر فیصلے صادر فرما دیے جاتے ہیں۔ اس افسانے کا بے نام کردار ہے جو ایک بوڑھے بابا سے اپنے بھائی کے شہید ہونے کے بارے میں پوچھتا ہے اور ان جنگوں کو بے مقصد قرار دیتا ہے جن میں ہزاروں نوجوان شہید ہو گئے۔ وہ بابا سے سوال کرتا ہے:

> ''میری ماں نے تو کسی کو نہیں کہا کہ اسے اپنے بیٹے کے شہید ہونے کی تمنا تھی جو پوری
> ہو گئی ہے۔ رہا میرا سوال تو بتا میں اس بھائی کو جس طرح بے مقصد جنگ کی آگ میں
> جھلسا کر خوش رہ سکتا ہوں۔''(۲۵)

اسی طرح افسانہ اناللہ وانا الیہ راجعون میں ایک شخص اپنی گمشدہ آواز کی بازیافت کے لیے ہر کسی کے پاس جاتا ہے۔ وکیل اور حاکم شہر تک اپنا قصہ لے کر جاتا ہے لیکن ناکام لوٹتا ہے۔ حاکم شہر نے اسے بتایا: ''تمہاری آواز نہ گم ہوئی ہے نہ ہی اسے کسی نے چوری کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ تمہاری آواز مر گئی ہے۔''(۲۶) مظہر الاسلام آمرانہ نظام پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ اس کے باعث اظہار پر پابندی پر سخت کڑھتے ہیں۔ پروفیسر فتح ملک کے نزدیک مظہر الاسلام سب سے زیادہ آزادی رائے کے طالب ہیں۔ اور اس ضمن اخباروں اور صحافیوں پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے مظہر الاسلام کے کئی افسانوں میں اخباروں اور خبروں کا ذکر ملتا ہے وہ اخباروں پر خبروں کو صرف گندگی کا ڈھیر سمجھتے ہیں۔ مظہر الاسلام نے اپنے افسانوں میں محبت اور آزادی کے متلاشی، بچھڑے ہوئے لوگوں اور احساس زیاں سے عاری لوگوں کی کہانیاں لکھی ہیں وہ غفلت کی نیند سونے والے لوگوں کو بیداری کی طرف لے جاتے ہیں اور ان کو متحد رہنے کا درس دیتے ہیں۔

## ب۔ مظہر الاسلام کے افسانے میں قنوطی وجودی عناصر

مظہر الاسلام کے افسانے میں قنوطی وجودی عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں ان کے افسانوں میں تنہائی، خوف، دہشت ، گھٹن اور موت کے جیسے وجودی عناصر ہیں۔

## خوف

خوف قنوطی وجودی عناصر ہے یہ ایسی کیفیت کا نام ہے جس میں انسان کو ہر وقت کسی نہ کسی چیز کا ڈر لگا رہتا ہے۔ فرد اپنے اوپر عائد بھاری ذمہ داریوں سے بھی خوف زدہ ہو جاتا ہے مظہر الاسلام نے جس دہائی میں افسانہ نگاری شروع کی اس وقت معاشرے میں ہر طرف خوف کا عالم تھا وہ خوف کے بارے میں لکھتے ہیں: ''آج کل تو خوف کا موسم ہے باتوں کی بارش کا موسم ہے۔ خوف گھر کی اکلوتی لالٹین کو پھونکیں مار مار کر بجھاتا ہے''[۲۷] ان کے افسانوں میں کرداروں کو معاشرے میں موجود دھوکہ دہی، فریب، مکاری سے خوف رہتا ہے۔ یہ ایسے معاشرے کی داستان ہے جہاں انسان دوسرے انسان سے محفوظ نہیں تھا اسے ہر وقت اپنے تحفظ کا خیال خوف میں مبتلا رکھتا۔ ملکی فضا خوف سے لبریز تھی۔ ان خدشات کو مظہر الاسلام نے اپنی کہانیوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ڈر جو ایک ہی جنس سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان پیدا ہو گیا تھا اس خوف کی وجوہات خود غرضی کا معاشرے میں جنم لینا تھا اپنی خاطر دوسرے کا نقصان کرنے سے گریز نہیں کرنا۔ غریب اور متوسط طبقہ کا استحصال کیا جارہا تھا قتل وغارت اور بم دھماکوں نے انسان کے اندر خوف پیدا کر دیا۔

جیسا کہ افسانہ سانپ گھر کے کردار میں خوف کو پیش کیا گیا ہے دفتر کے اس ملازم کو ہر طرف صرف سانپ ہی سانپ معلوم ہوتے ہیں ہیں حتیٰ کہ اسے انسانوں میں بھی انسانی شکلوں میں بھی دکھائی دیتے ہیں کہ ان کو جو کہ انسان کا دشمن سمجھا جاتا ہے اور اس کے ڈسنے سے انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے کچھ ایسی ہی صورتحال کو اس افسانے میں بیان کیا گیا ہے کہ جو اس وقت کے معاشرے کی حالت تھی۔ لوگ ایک دوسرے کی زندگیوں کے درپے ہو گئے تھے۔ اس افسانے کا کردار جس خوف کا شکار ہے وہ اسے اندر ہی اندر اس کے وجود کو کھائے جا رہا ہے اسے ہر وقت یہ احساس کہ شہر کے لوگوں کی حالت بدترین ہوتی جارہی ہے۔ وہ اپنے اندر بننے والے خوف کو یوں بیان کرتا ہے۔ اسے یوں لگا جیسے دفتر میں سانپ ہی سانپ رینگ رہے ہوں۔ انسانوں کے اندر انسان دشمنی کا زہر پھیل گیا تھا اس کو مظہر الاسلام یوں بیان کرتے ہیں

"ہو سکتا ہے تمہیں پتا بھی نہ چلا ہو اور سانپ نے تمہارے خون کو زہریلا اور گندہ کر دیا ہو۔ لو سانپ کا ڈسا ہوا بھی کبھی بچ سکتا ہے؟ اس کے ساتھی نے تعجب سے پوچھا یہی تو تمہیں پتا نہیں میرے بھائی۔ دو منہ والے سانپ کے ڈسے سے انسان ایک دم نہیں مرتا۔"(۲۸)

اس خوف کے باوجود وہ سماج میں تبدیلی کا خواہاں ہے وہ کہتا ہے:

"کبھی کبھی اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ سارے شہر کو جڑ سے اکھاڑ کر الٹا دے تاکہ جب سارے سانپ نیچے گر پڑیں تو پھر سے شہر کو سیدھا کر کے اپنی جگہ پر لگا دے۔"(۲۹)

ہر وقت خوف میں مبتلا رہنا انسان نفسیاتی طور پر کمزور اور بیمار کر دیتا ہے سانپ گھر کا کردار بھی نفسیاتی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ "اس نے اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے جلدی سے کہا ایک کپ گرم گرم پھنکار لے آؤ۔"(۳۰) مظہر الاسلام نے خوف کے بارے میں یوں تحریر کیا ہے:

"خوف تو اس عہد کا استعارہ ہے اندھیرا ابھری ہوئی بندوق کندھے پر رکھ کر گھومتا ہے روشنی کالی چادر میں اپنی چیخ لپیٹے کچہریوں کی طرف بھاگتی ہے مگر راہ میں شہر کا بڑا تھانہ پڑتا ہے۔"(۳۱)

اس افسانے میں انسان دشمنی کو موضوع بنایا گیا ہے جب انسان کے خون میں بے وفائی، منافقت اور ریاکاری شامل ہو جائے تو وہ انسانیت کا ہی دشمن بن جاتا ہے۔ معاشرے میں کئی ایسے لوگ موجود تھے جن کے خون میں ریاکاری اور انسان دشمنی رچ بس چکی تھی۔ اس افسانے کے مرکزی کردار کو بھی یہی تشویش لاحق تھی کہ پورا معاشرہ اس مرض میں مبتلا نہ ہو جائے اس کی وجہ سے وہ ہر وقت بے چین رہتا تھا۔ وہ انسان کے دہرے رویے یا رخ سے اس قدر پریشان تھا کہ وہ اس کو دو منہ والا سانپ قرار دیتا تھا: "دو منہ والے سانپ کے ڈسنے سے انسان ایک دم نہیں مرتا بلکہ آہستہ آہستہ اور گھل گھل کر جان دے دیتا ہے۔"(۳۲) اس افسانے میں

انسانیت کے پست درجے تک گرنے پر طنز کیا گیا۔ انسانوں کے اندر چھپے ہوئے انسان دشمنی اور اس نفرت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جو کہ انسان کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی اور انسان اندر سے کھوکھلے ہو گئے تھے۔

مارشل لا کے باعث ملک کی فضا خوف و ہراس کا شکار تھی۔ حکم زباں بندی عام تھا شہر میں امن نہیں تھا۔ ہر طرف خوف کی سولی لٹک رہی تھی شہری بے یقینی کی زندگی گزار رہے تھے اور ایسی راہ کے مسافر تھے جس کی کوئی منزل نہ تھی۔ ڈاکٹر صفیہ عباد کے مطابق ستر کی دہائی کی کہانیوں میں اجتماعی خوفزدگی نمایاں ہے۔ ہر طرف خوف کا عالم ہے۔ کہانی کی مٹھی میں ڈرامہ میں بھی خوفزدگی کے رویے پر شدید تنقید کی ہے اس میں دو کردار ہیں کہانی نویس اور پروڈیوسر کہانی میں ایک درمیانی عمر کا آدمی ہے جو دور سے پیدل چل کر آتا ہے پولیس پیدل چلنے والوں سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور اس شخص سے سوال کرتی ہے

"کہاں جا رہے ہو؟

مارکیٹ کے چوک تک

کیوں ؟

ایک ضروری کام سے

کیسا ؟

ذاتی نوعیت کا۔

ہمیں بھی پتہ چلے پولیس میں کی آواز میں رعب ہے

کیا آج کل رات کو گھر سے نکلنا منع ہے؟

نہیں مگر تم کہاں جا رہے ہو؟

بتایا نا کہ ذاتی نوعیت کا کام ہے بالکل ذاتی۔ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ یقین جانیے میں کوئی تخریب کار نہیں۔ اسی ملک کا رہنے والا ہوں پاکستانی ہوں ایک شریف شہری ہوں میرا ریکارڈ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔"(۴۴)

مظہر الاسلام میں اس عہد میں پھیلے پولیس کے خوف اور پولیس کی طرف سے عوام پر بے گناہ الزامات عائد کرنے پر طنز کیا ہے۔ مظہر الاسلام شہریوں کی بے بسی کی زندگی گزارنے پر بھی طنز کرتے ہیں۔ مذکورہ افسانے کا کردار ہے کہتا ہے ''میرے شہر کے لوگوں کی قسمت بھی عجیب ہے وہ آدھی زندگی خوف میں اور آدھی زندگی انتظار میں گزار دیتے ہیں''(۳۴) وہ ایسی زندگی گزارنے کے قائل نہیں ہیں بے حس لوگوں کی طرح زندگی گزارنا نہیں چاہتے جو ہر بات کو ٹال دیتے ہیں بلکہ وہ اپنا شمار معاشرے کے حساس طبع لوگوں میں کرتے ہیں جو کہ معمولی سی بات کو بھی بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں اور اس پر طنز کرتے ہیں وہ خوفزدہ زندگی کو بے کار تصور کرتے ہیں:

''خوفزدہ زندگی کس کام کی، ابھی کوئی پکڑ لے گا، ابھی کوئی پکڑ لے گا اس طرح کی بے چینی اور خوف میں ڈوبی ہوئی زندگی بے بس چوہے کی طرح ہوتی ہے جیسے چوہے دان سے نکلتے ہیں بچے گھیر لیتے ہیں اور پتھر مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔''(۳۵)

افسانہ پاگل بھی ایسے ہی ماحول کی عکاسی کرتا ہے جس کا مرکزی کردار خوف کی وجہ سے اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے اور پاگل ہو جاتا ہے احتجاج کرنے پر پابندی کی وجہ سے وہ اپنی ہی ذات سے متصادم ہو جاتا ہے جب جذبات کی شدت حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو وہ خود کو ایک بندر تصور کرنے لگتا ہے وہ شہر کی حالت کو یوں بیان کرتا ہے: ''شہر میں جہالت اور محرومی پھیل رہی ہے بندوقوں کے بٹ مار مار کر ہمیں بندروں کی طرح نچایا جا رہا ہے۔''(۳۶) وہ خود کو ایک بے زبان جانور سمجھتا ہے اور بندروں کی طرح ناچنا شروع کر دیتا ہے ''شاوا بھئی بکریا۔۔ تو بے زبان جانور ہے گھاس کھانے والا۔۔۔ یہ سب طاقت کا جھگڑا ہے۔''(۳۷) مظہر الاسلام کی کہانیوں میں خوف کی فضا چھائی رہتی ہے جو کہ خارجی حالات کے پیدا کردہ ہے اور کبھی کرداروں کو اندرونی طور پر کھوکھلا کر رہا ہوتا ہے

## وحشت / گھٹن

وحشت ایسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اس وقت محسوس ہوتی ہے جب اس کا دکھ اپنی انتہا کو پہنچ جائے اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر رہا ہوں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط ایسی حالت میں انسان کو اپنے وجود سے ہی وحشت ہونے لگتی

ہے۔ مظہر الاسلام نے اپنی کہانیوں کے کرداروں میں بھی اکثر اس وحشت کو دکھایا ہے جس کے باعث انسان اس سے اکتا جاتے ہیں کہ وہ اپنے ارد گرد پھیلی بے حسی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور معاشرے میں پھیلے اس زہر کو اپنے اندر سرایت کر لیتے ہیں۔ لوگ اس قدر بے حس ہو چکے ہیں وہ اخلاقی اقدار کو کھو جانے پر کسی غم یا دکھ کا اظہار نہیں کرتے اور ان کے سامنے ان برائیوں کا تذکرہ کیا جائے تو وہ ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔ زوال پذیر معاشرے میں دور اندیش لوگوں کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیتا بلکہ الٹا ہی ان کی اس کو ذہنی مریض سمجھا جاتا ہے اور ان کی باتوں کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔

اسی وحشت کا شکار ''لائن مین اب شہر کی شکایت کسے کرے'' کے مرکزی کردار کو ہوتی ہے جو کہ ایک حساس انسان ہوتا ہے اور معاشرے کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت شدت سے محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس کو اپنے آپ سے اور اپنے اس معاشرے سے ایک وحشت سی ہونے لگتی ہے کیونکہ وہ لوگوں کی بگڑی ہوئی حالت اور اپنے شہر کی حالت زار کو بار بار بیان کرتا ہے۔ وہ بارہا لوگوں کو احساس دلانا چاہتا ہے کہ شہر کی حالت بگڑتی جا رہی ہے لیکن اس کی بات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا تو اسے اپنے ہی آپ سے ڈر لگنے لگتا ہے۔

وہ شہر کی حالت کا جائزہ اس وقت لیتا ہے جب وہ کسی کھمبے پر بجلی ٹھیک کرنے کی غرض سے چڑھتا ہے۔ جب شہر کی حالت دیکھتا ہے تو اسے وحشت سی ہوتی ہے کہ ہر طرف خود غرضی، خوشامد اور منافقت نے ڈیرے ڈالے ہیں۔ ہر شخص اپنی اپنی دھن میں مصروف ہے وہ دنیا میں اس قدر مگن ہے کہ اپنی اصلیت کو بھی کھو چکا ہے وہ سارے شہر کی اس حالت کو دیکھ کر وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔ اس بیمار زدہ کیفیت کا ذکر وہ شہر کے دوسرے لوگوں سے بھی کرتا ہے لیکن کوئی بھی اس کی بات کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ پہلی بار جب وہ کھمبے پر بجلی ٹھیک کرنے کے لئے اوپر چڑھا تو اس نے وہاں سے شہر کو دیکھا۔ لائین مین شہر کی حالت کا جائزہ لیتا ہے: ''آج اس نے پہلی بار اوپر سے کچھ فاصلے پر شہر کو دیکھا ہے اسے بڑی تشویش ہے شہر کی حالت تسلی بخش نہیں ہے ''[۳۸] کچھ دن بعد وہ بجلی کی شکایت کے باعث پھر کھمبے پر چڑھا اور اس نے پھر غور سے شہر کو اوپر سے دیکھا اور نیچے اتر کر لوگوں کو بتایا کہ شہر میں منافقت اور خوش آمدید فروغ پا رہی ہے لیکن لوگ اس کی بات سن کر ہنس پڑے اور اس کی بات کا بلکل نوٹس نہ لیا۔ اسی طرح لوگوں میں سے ایک دوسرے کو معاف کرنے کا جذبہ بھی ختم ہونے پر اسے دکھ پہنچا ہے اور لوگوں کی حالت کا ذکر اپنی ماں سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے

"ماں لوگوں میں معاف کر دینے اور در گزر کر دینے کا جذبہ مر گیا ہے وہ
چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بڑی بڑی سزا تجویز کرنے کی عادی ہو گئے ہیں
اب تو وہ اپنے فیصلے بھی خود نہیں کر پاتے۔"(۳۹)

اس کی وحشت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب وہ انسان کو ایک عجیب الخلقت قرار دیتا ہے۔ خوشامد اور جہالت نے انسان کو اس مقام تک پہنچا دیا کہ وہ اپنی اصلیت بھول بیٹھا ہے ایسے معاشرے میں انسان کو انسان سے ہی وحشت محسوس ہونے لگی "شہر میں انسان نما عجیب و غریب قسم کی مخلوق بھی پھر رہی ہے بہت خون خوار۔"(۴۰) اپنے وجود کی اصلیت اور حقیقت کو بھول جانا انسان کو ایسی وحشت میں مبتلا کر دیتا ہے کہ اسے خود سے خوف محسوس ہونا شروع ہو جاتا ہے اور خوف انسان کو موت کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ معاشرے میں پھیلی مطلب پرستی، ریاکاری، انسان دشمنی اور منافقت نے پوری فضا کو خوفزدہ کر دیا۔ جنگ کی تباہ کاریوں، بم دھماکوں اور مارشل لاء کی سختیوں نے فرد کو ایک ایسی راہ فراہم کیں جس کے بعد اسے خود سے ہی نفرت ہونے لگی اور اپنا وجود بھی بھاری محسوس ہونے لگا۔

کندھے پر کبوتر، افسانہ ایسی ہی ایک دردناک کہانی ہے جس میں انسان بھیڑیے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مظہر الاسلام نے معاشرے کے اس سنگین مرض کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جس میں چوکیدار مالک بن کر بیٹھ گئے تھے۔ اس افسانے میں ان لوگوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جنہوں نے طاقت کے باعث دوسرے لوگوں کے حقوق کو غضب کر لیا۔ اس افسانے میں بچے کو اپنے چوکیدار سے وحشت ہونے لگتی ہے وہ گھر واپسی پر دیکھتا ہے کہ چوکیدار آدھا کا حصہ بھیڑیے کی شکل میں بدل گیا ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے:

"اس نے صحن میں جھانکا تو حیرت اس کے چہرے پر ناچنے لگی۔ چوکیدار اکڑ کر کرسی
پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کا دھڑ بھیڑیئے کے دھڑ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے
بھونچال آگیا ہو وہ جم کر دیوار پر بیٹھ گیا۔ بھیڑیے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر سوچنے لگا
کیا چوکیدار کے اندر پہلے ہی بھیڑیا موجود تھا یا باہر سے آکر کوئی بھیڑیا اس کے اندر
داخل ہو گیا ہے۔"(۴۱)

پروفیسر فتح ملک اس کہانی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں: ''یہ کہانی صرف ہماری واردات ہی نہیں بلکہ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک کے مصائب کی ترجمان ہے۔''(۴۲) وحشت اور گھٹن کے باعث کردار جھنجھلائے ہوئے ہیں وہ جھوٹ اور مکر و فریب کی زندگی گزارنا نہیں چاہتے ہیں۔

مایوسی و اداسی، تنہائی ایسے عناصر تھے جنہوں نے مل کر معاشرے میں گھٹن کو جنم دیا۔ بہت دیر تک ایک جیسی کیفیت میں گھٹن کی فضا کو تشکیل دیا جس میں رہنے والا آدمی حبس زدہ فضا میں سانس لینے میں تکلیف محسوس کرتا تھا۔ مظہر الاسلام نے گھٹن زدہ اس فضا کو افسانوں میں اس طرح گوندھ دیا کہ یہ کہانی کا جزو نظر آتی ہے۔ انسان نے جب معاشرے میں اخلاقی گراوٹ کو شدت سے محسوس کیا اور اس پھیلی ہوئی نفرت کے خلاف آواز بلند کی لیکن معاشرے میں ایسے لوگوں کی کسی بات پر دھیان نہ دیا جاتا۔ احساس زیاں سے محروم لوگوں کو دیکھ کر حساس فرد ذہنی الجھن کا شکار ہو گیا اور اسے گھٹن محسوس ہونے لگی۔ اس ماحول نے حساس طبیعت فرد کے لیے راہِ فرار کے راستے ہموار کیے۔ فرد کو ذہنی مریض بنا دیا جو نفسیاتی طور پر اس ماحول میں زندہ رہنے میں دشواری محسوس کرنے لگا۔ خود غرضی، منافقت اور جھوٹ نے ایک حساس شخص کے لئے مسائل کھڑے کر دیے۔ کہانیوں کے بیشتر کرداروں نے معاشرے کے منفی رویوں کی شکایت کی کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو دوسروں کے لیے فلاح کا کام کرے ہر طرف خوف و ہراس پھیلا تھا ملک تاریخ کے بدترین حالات کا سامنا کر رہا تھا۔

افسانہ پاگل کا مرکزی کردار گھٹن کا شکار ہے کیونکہ وہ اپنے شہر کے حالات کو دیکھ کر کر جو کہ ایک عرصہ سے اسی طرح چلے آرہے ہیں اور ان میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آرہی۔ وہ ان حالات سے پریشان دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایسی مشکل کا شکار ہے جہاں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ نفسیاتی دباؤ کا شکار یہ کردار سانس لینے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ اس کا دوست اس کی کیفیت کو بیان کرتا ہے:

> ''گزشتہ دو تین سالوں سے اس کی طبیعت میں بہت زیادہ گھبراہٹ آگئی تھی صبح صبح اخبار پڑھنے کے بعد وہ یک دم سانس کی تکلیف محسوس کرتا اور جلدی جلدی صرف اپنے کمرے کی نہیں گھر کے سارے کمروں کی کھڑکیاں کھول دیتا۔''(۴۳)

ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے سانس کی تکلیف نہیں بلکہ نفسیاتی طور پر ایسے محسوس کرتا ہے جب وہ تکلیف دہ بات سوچتا ہے تو نفسیاتی دباؤ میں اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اس ذہنی کیفیت نے اس کو پاگل پن کا شکار کر دیا اس کی ماں اس کے ذہنی توازن بگڑنے کی وجوہات بیان کرتی ہے۔

"چند ماہ پہلے ایک صبح وہ اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا ماں اب میں تھک گیا ہوں میرے اندر برداشت ختم ہو گئی ہے مجھ سے شہر کی حالت دیکھی نہیں جاتی میرا دم گھٹ رہا ہے۔" (۴۴)

مظہر الاسلام نے اس زمانے میں شہر کی حالت کو بیان کیا کہ جب سب لوگ صرف اخباروں کی سرخیوں میں تبدیلی کے منتظر تھے وہ روزانہ اخبار کا اخبار پڑھتے کہ آج کوئی ایسی خبر ملی جس سے حالات بدل جائیں۔ ایسے حالات میں وہ جینے پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ افسانہ پنجرہ کا مرکزی کردار بھی اسی گھٹن کے باعث موت کو ترجیح دیتا ہے اور معاشرے میں پھیلی ہوئی بے حسی اور جہالت کے خلاف خود کو بے بس جان کر خودکشی کر لیتا ہے۔ اس کا دوست عدالت نے اس کے بارے میں یوں بیان دیتا ہے۔

"وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو شدت سے محسوس کرنے لگا تھا۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹ جائے گا وہ اکثر دم گھٹنے کی شکایت بھی کرنے لگا تھا۔" (۴۵)

مذکورہ افسانے کا کردار لڑکی جو کہ عدالت میں اس کے لئے گواہی دیتی ہے کہ اس نے خودکشی نہیں کی اس کی سانس کی بیماری کی وجہ یوں بیان کرتی ہے: "اسے کچھ لوگوں نے خوشامدی بننے پر مجبور کیا تھا جس کے بعد وہ سانس کی تکلیف محسوس کرنے لگا تھا۔" (۴۶) اکثر کردار خارجی حالات کے باعث لگائی گئی پابندیوں سے گھٹن محسوس کرتے ہیں انسان فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے وہ قید و بند کو اپنے لیے پسند نہیں کرتا، مظہر الاسلام بھی ان پابندیوں کے خلاف نظر آتے ہیں وہ آزاد فضا میں سانس لینا چاہتے ہیں۔

## کرب

تنہا، مایوس اور اداس شخص کی تکلیف میں مزید اضافہ وجود کے کرب کی صورت میں ہوتا ہے۔ انسان جب یہ سوچتا ہے کہ وہ بے معنی زندگی گزارنے پر مجبور ہے نہ وہ اپنی مرضی سے اس دنیا میں آیا ہے اور نہ اپنی مرضی سے اس قید سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے یہ سوچ انسان کو اندر ہی اندر خالی کر دیتی ہے اور اندر سے یہ کھوکھلا انسان اپنے وجود کو بھی قید سمجھتا ہے۔ مظہر الاسلام نے ایسے معاشرے کے کرب کو بیان کیا ہے جہاں بولنے پر بھی پابندی تھی نہ کوئی انسان کسی کی مدد کر سکتا تھا اور نہ ہی ظلم کے خلاف احتجاج کر سکتا تھا۔ صرف اپنے ہی وجود میں ایک قیدی تھا۔ افسانہ پنجرہ کا مرکزی کردار جو کہ اپنے وجود کو ایک قید سمجھتا تھا سالگرہ کے دن اس کے لیے اذیت ناک محسوس ہوتا تھا وہ اپنے اس کرب کو یوں بیان کرتا ہے: ”مجھ سے اب اپنے جسم کے اس مکان میں رہا نہیں جاتا۔“(۴۷) سالگرہ کے دن وہ اپنے وجود کے بارے میں میں خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے: ”میں تو قیدی ہوں تم نے مجھے احساس دلایا کہ مجھے پورے ۳۷ سال ہو گئے ہیں قید میں“(۴۸)

”پھر وہ بولا میں اقرار کرتا ہوں کہ میں اچھا قیدی بھی نہیں ہوں اس لئے کہ
آج تک میں ان اصولوں کا احترام نہیں کیا جو اچھے قیدی کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔“(۴۹)

افسانہ پنجرہ میں وجود کا کرب ہے جو کہ بنیادی کردار پر ایک بوجھ ہے۔ یہ ایک ایسے آدمی کی کہانی ہے جس کے قتل کے مقدمے کی عدالت میں سماعت جاری ہے کہ کیا وہ پاگل تھا یا اس نے خودکشی کی ہے۔ وکیل اس کے دوست سے بیانات لے کر عدالت میں اسے ایک ذہنی مریض قرار دینے کی کوشش کرتا ہے اور لڑکی اس کے تمام بیانات کی تردید کرتی ہے کہ وہ ذہنی مریض نہیں تھا بلکہ وہ معاشرے کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دیکھتا اور اس کے نازک احساسات کو بھی محسوس کر لیتا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ وہ پاگل نہیں تھا اور اس نے خودکشی نہیں کی۔ اس کا دوست اس کے مزاج کے بارے میں بتاتا ہے:

”وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو شدت سے محسوس کرنے لگا تھا کبھی کبھی یوں
لگتا تھا جیسے سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ وہ اکثر دم گھٹنے
کی شکایت کرنے لگا تھا۔“(۵۰)

وہ شخص شہر چھوڑنا چاہتا تھا کیوں کہ شہر میں ہوس پرستی بڑھ گئی تھی اور پیار ختم ہو گیا تھا۔ اسے روشنی کم اور اندھیرا زیادہ لگتا تھا معاشرے کے حساس لوگوں سے اس کا تعلق تھا جو ان باتوں کو محسوس کرتے تھے اور اداس رہتے تھے۔ اس کا دوست عدالت میں اس شخص کی اندرونی تشویش کو یوں بیان کرتا ہے: ''اس کے اندر ایک آگ جلتی رہتی تھی کبھی کبھی اس کی کیفیت بالکل ایسے شخص کی جاتی تھی جسے تھوڑی دیر بعد مر جانا ہو۔''[۵۱] افسانے کے مرکزی کردار کو ہر چیز لغو سی معلوم ہوتی ہے وہ دنیا کی بے حسی کو اس قدر اپنے اندر سمو لیتا ہے کہ وہ خود بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہونا چاہتا ہے۔

> ''اس نے مجھے بتایا کہ میرے خاندان میں غصہ بہت ہے اس کا دادا اور اس کا باپ بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کو شدت سے محسوس کرتے تھے وہ سب کھلی کھلی صاف اور سچی باتیں سوچنے، کہنے اور سننے کے مرض میں مبتلا تھے کئی بار اس نے مجھ سے کہا کاش میں بھی ایسا ہو جاؤں کہ صرف اپنے مطلب سے غرض رکھوں اور کسی بات کو محسوس نہ کروں۔''[۵۲]

لیکن وہ اس کرب کو لے کر جینے کے بجائے موت کو ترجیح دیتا ہے: '' اگر میں اتنا بے حس ہو جاؤں تو اس سے بہتر ہے کہ میں مر جاؤں۔''[۵۳] اس کی ذہنی کیفیت نے اسے تنہائی پسند کر دیا اور دوسرے لوگوں کے مسائل دیکھ کر کڑھتا رہتا۔ اب نہ اپنے لئے اور نہ کسی کے لئے کچھ کر سکتا ہے وہ خود کو جسم میں قید سمجھتا تھا

معاشرے کے غیر متوازن پہلو اس کی تکلیف میں مزید اضافہ کرتے ہیں کیونکہ وہ اس کو بدل نہیں سکتا۔ وہ برائی کو محسوس ضرور کرتا ہے لیکن اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ ایسی سوچ انسان کو ایسے کرب میں مبتلا کرتی ہے جس سے وہ چھٹکارہ صرف موت کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ تو میں اسے معمولی نظر آنے لگے پسند کی جانے لگے۔ مظہر الاسلام کے افسانوں کے اکثر کردار اس کیفیت سے دوچار ہیں انہوں نے ایسے معاشرے کی صورتحال کو موضوع بنایا جس میں ایک حساس انسان کے لیے اس کا وجود ہی اذیت ناک بن گیا تھا۔

جہاں فرد ایک اذیت ناک صورتحال کا سامنا کر رہا تھا جس میں اخلاقی اقدار اور معاشرتی اصولوں کو روندھا جا رہا تھا روزانہ اخبار میں سرخیوں کو پڑھنا اور اپنے جیسے دوسرے لوگوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنتے دیکھنا ایک دکھ دہ عمل تھا کہ جس کا مداوا ناممکن تھا۔ اس ناامیدی کے باعث انسان نفسیاتی طور پر پاگل پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ افسانہ پاگل، کا مرکزی کردار خود کو بندر تصور کر لیتا ہے اور بندر بن کر ناچتا ہے کہ بندروں کی طرح نچایا جا رہا ہے اور ناقابل برداشت صورتحال اس مقام تک پہنچ جاتی ہے: ”میرے اندر برداشت ختم ہو گئی ہے مجھ سے شہر کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔“(۵۴) اسی طرح افسانہ ، باتوں کی پیالی میں ٹھنڈی چاہے، کی کردار لڑکی تنہا اور اداس ہوتے ہوئے خود کو قیدی تصور کرتی ہے۔ وہ خود کو ایک پنجرے میں قید پرندے کی طرح سمجھتی ہے۔ وہ جذبات کے ڈھیر سے خود کو آزاد کرنا چاہتی ہے۔ وہ کہتی ہے:

> ”میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو آزاد کر دوں۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔۔
> میں نے پوچھا: کہنے لگی! میں نے اپنے آپ کو قید کر رکھا ہے الف لیلہ کی شہزادی کی
> طرح اپنے وجود کے اندھے کنویں میں۔“(۵۵)

اپنے وجود کو ثابت کرنے کے لئے انسان نے خود کسی عمل کو انجام دینا ہوتا ہے جو اس بات کی گواہی دے کہ ہاں وہ موجود ہے۔ عذاب پوش پرندے میں ایک شخص اس کرب میں مبتلا ہے کہ کیا وہ موجود ہے یا نہیں ایک لمحے کے لیے وہ سوچتا ہے کہ وہ موجود ہے لیکن اگلے ہی لمحے اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وجود کو ثابت کرنے کے لئے عمل اور گواہ کا ہونا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے: ”ہم سب کو خود اپنا ثبوت پیش کرنا ہوگا۔“(۵۶)

وہ اپنے اس وجود سے تنگ آ چکا تھا اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا وہ ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کا شکار ہو چکا تھا جس میں وہ خیالی طور پر عیار، مکار اور مجرم لوگوں کا قتل کر کے خود کو پرسکون کرتا محسوس کرتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ پانچ رویوں کا قتل کرتا ہے

## اداسی، تنہائی

مظہر الاسلام کی کہانیوں کے اکثر کردار تنہائی اور اداسی کا شکار ہیں وہ معاشرے کے حساس لوگ ہیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کرتے ہیں اور تنہا رہتے ہیں۔ اداسی اور تنہائی کو نشے کے طور پر لیتے ہیں اور اس سے

محظوظ ہونے لگتے ہیں۔ تنہائی ایک خطرناک کیفیت ہے جس میں مبتلا ہو کر انسان ایسی نفسیاتی کیفیت تک جا پہنچتا ہے جہاں وہ اداس رہنے لگتا ہے اور دوستوں اور ہجوم سے نفرت سی ہونے لگتی ہے۔ یہ نفسیاتی صورتحال انسان کا ذہنی توازن بگاڑ دیتی ہے۔ وجودیت کے مطابق انسان تنہا پایا گیا ہے. اس کی تنہائی کا کوئی حل نہیں معاشرے میں چاہے جیسا بھی نظام قائم ہو انسان تنہا ہے. علاوہ ازیں صنعتی ترقی کی وجہ سے انسان کی مصروفیت نے بھی اسے تنہا کر دیا وہ اکیلا زندگی گزارنے لگا۔ یہی تنہائی اسے مایوسی کی طرف مائل کرتی ہے وجودی مفکرین جو کہ فرد کی انفرادیت پر زیادہ زور دیتے ہیں اس لیے وہ کسی اجتماع یا گروہ کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے مطابق تنہائی وہ راستہ ہے جو داخل کی طرف جاتا ہے اور اپنی تلاش کا ذریعہ ہے۔

تنہائی کے باعث وہ خودکشی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ افسانہ شام کی دیوار کے اس پار، میں تنہا شخص جو کہ بم دھماکوں سے خوف زدہ ہو کر تنہا کمرے میں بیٹھا ہے۔ ”مجھے یوں لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو کیا بات ہے تنہائی سے گھبرا گئے ہو خودکشی کرنے کا ارادہ تو نہیں“(۵۷) یہ ایک مضطرب شام کی کہانی ہے کہانی نویس اس کو پڑھنے کے مناسب وقت بتاتا ہے لیکن دو اوقات میں اسے پڑھنے سے سختی سے منع کرتا ہے۔ وہ صبح ناشتے کے میز پر اسے پڑھنے سے روکتا ہے کیونکہ اس کہانی میں اس قدر کڑواہٹ ہے کہ مکھن کا ذائقہ بھی کڑوا لگنا شروع ہو جائے گا۔ دوسرا نیند کے بستر پر اس کے پڑھنے سے نیند اڑ سکتی ہے۔ یہ اندر سے تنہا انسان کی کہانی ہے جو کرفیو کے دنوں میں خوف کے مارے کمرے میں چھپ کے بیٹھا ہے۔ انسان کی اندرونی تنہائی کو یوں بیان کرتا ہے جو کہ خوف کا باعث بنتی ہے: ”جب کوئی انسان اندر سے تنہا اور ویران ہو جاتا ہے کسی اجاڑ خالی کمرے کی طرح تو چھپکلیاں اس انسان کے اندر بھی گھر بنا لیتی ہیں“(۵۸) انسان کی اندرونی تنہائی اسے اجاڑ دیتی ہے وہ خود کو بے حد تنہا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسی تنہائی کے باعث وہ بعض اوقات اپنے لیے موت کا انتخاب کرتا ہے۔ اس افسانے میں ملک میں نافذ کرفیو پر طنز ملتا ہے۔

اسی طرح افسانہ پنجرہ کا مرکزی کردار بھی تنہائی کا شکار ہو کر پاگل پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ تنہائی ایسی کیفیت ہے کہ جو اکثر کرداروں کو خودکشی کی طرف مائل کرتی ہے افسانہ پنجرہ میں ایک شخص جو کہ تنہائی کی وجہ سے خودکشی کر لیتا ہے اس کے بارے میں اس کا دوست بتاتا ہے کہ وہ اپنی کتابوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا اور بہت زیادہ تنہا ہو جاتا۔ کچھ کردار تنہائی سے لذت محسوس کرنے لگے تھے

”وہ الگ تھلگ رہنا پسند کرتا تھا اسے تنہا رہنے میں مزہ آتا تھا وہ اکثر
کہا کرتا تھا چلو کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں کوئی واقف کار نہ ہو کوئی
ہمیں جانتا نہ ہو نہ پہچانے جانے میں اسے لطف محسوس ہوتا۔“(۵۹)

تنہائی انسان کو نفسیاتی الجھن کا شکار کر دیتی ہے مذکورہ افسانے کا کردار بھی ایسے ہی الجھن کا شکار ہو گیا تھا اس کا دوست بیان کرتا ہے: ”وہ کہا کرتا تھا مجھ سے ہم اپنے جسم کے مکان میں رہا نہیں جاتا یہاں بے پناہ تنہائی ہے “(۶۰) بن بیاہی بات، یہ افسانہ بھی ایک تنہا اور اداس شخص کی کہانی ہے کا کردار اپنی اداسی کے بارے میں لڑکی کو بتاتا ہے

”وہ جب بھی کسی لڑکی سے ملتا ہے اسے اداس کر دیتا ہے اداسی اس کا
پکنک سپاٹ ہے اور جب بھی کوئی لڑکی اس سے ملتی ہے تو وہ اسے پکنک
سپاٹ پر لے آتا ہے۔“(۶۱)

شہر پناہ، میں ایک شخص اپنا گمشدہ شہر دوبارہ تلاش کر رہا ہے۔ اس کہانی میں معاشرے میں پھیلی تنہائی اور اداسی جس کو پھیلے مدت ہو گئی تھی اس پر طنز کیا۔ شہر پناہ کا آدمی اپنے شہر کی ساری خصوصیات بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کے پہلے اس شہر میں امن تھا۔ ”لوگوں کے دل اجاڑ نہیں تھے اداسی اور تنہائی کا موسم بہت کم وقت کے لیے آتا تھا۔“(۶۲) تنہائی کے پس پردہ معاشرے میں پھیلے نفسا نفسی، بدامنی منافقت اور جہالت بھی تھی جس میں فرد کو تنہا کر دیا تھا۔ کردار سے روٹھی ہوئی کہانی، کا مرکزی کردار تنہا ایک گھر میں رہتا تھا۔

”جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تو میرا دوست بن گیا وہ تنہا اور اداس رہتا تھا“(۶۳) ” اسے اکیلا رہنا پسند تھا اس کا خیال تھا کہ ”لوگ اسے سمجھتے نہیں“(۶۴) مذکورہ بالا افسانے کر کردار خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے ”میں ازلی تنہا ہوں اور اداسی سے میرے مقدر میں لکھی گئی ہے۔“(۶۵) مظہر الاسلام کے بیشتر کردار اس تنہائی کا شکار ہیں کہانی کی مٹھی میں ڈرامہ، میں لکھتے ہیں کہ اداسی میرے خمیر میں شامل کر دی گئی ہے۔

## موت

موت کا ذکر تمام وجودی مفکرین کے ہاں ملتا ہے ہائیڈگر کا خیال ہے کہ موت انسانی زندگی کے مقاصد کو ناکارہ بناتی ہے اگر موت کا ہی انسان نے سامنا کرنا ہے تو زندگی کا کیا مقصد ہے۔ اور موت کے خوف سے ہی انسانی

شخصیت بھی تشکیل پاتی ہے اس کے ساتھ یہ دنیا کو مہمل بھی بناتی ہے۔ دیگر مفکرین کے نزدیک بھی موت انسانی زندگی کا خاتمہ بڑی آسانی سے کرتی ہے اور انسان کو ہر وقت موت کا خوف رہتا ہے۔ وہ زندگی کے بعد موت کے قائل نہیں نظر آتے، بعض مفکرین کے نزدیک اس وجود سے آزادی حاصل کرنے کے لئے موت کو خود اپنے لیے منتخب کرنا ہے انسان کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے موت کا انتخاب کر سکتا ہے ان کا خیال ہے انسان کو اس کی مرضی کے بغیر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے لہٰذا وہ اپنی مرضی سے اس دنیا میں زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اگرچہ موت اور خودکشی دو مختلف چیزیں ہیں لیکن انجام وہی جہاں ہے جو آنکھوں سے اوجھل ہے اسی طرح ادیبوں میں خودکشی کا رجحان بھی پایا جاتا ہے وہ اپنے حساس پن کی وجہ سے اس دنیا سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں۔ مظہر الاسلام کے افسانوں میں موت کا ذکر تسلسل کے ساتھ موجود ہے یوں کہا جا سکتا ہے کہ موت مظہر الاسلام کا پسندیدہ موضوع ہے۔ ان کی کہانیوں کے اکثر کردار خودکشی کر لیتے ہیں ۔ زمانے کی بے حسی، تنہائی، مایوسی اور محرومی کو برداشت نہ کرنے کے بعد موت کو ہی اپنے لیے بہتر سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صفیہ عباد لکھتی ہیں:

> ”خودکشی کا موضوع مظہر الاسلام کا پسندیدہ موضوع ہے۔ ابتدا کی تقریباً ہر کہانی میں خودکشی کا موضوع اس طرح بنا ہوا ہے۔ جیسے اون سلائیاں بنتی ہوئی کوئی لڑکی ہر خانے کے بعد اپنی پسند کا نمونہ ڈالتی چلی جائے۔ یا کڑھائی کرتی ہوئی کوئی دوشیزہ پھول کاڑھتے ہوئے اپنے پسند کے رنگ کا دھاگا لگانا نہ بھولے۔“(۶۶)

ایک شام میں چڑیا کو چگ لیا، افسانے میں چڑیا کہانی نویس کو اس کہانی کو انجام دینے کا کہتی ہے ورنہ لڑکا یا لڑکی خودکشی کر لے گا، جلدی کرو اسے سمجھاؤ اور اس کہانی کو انجام تک پہنچاؤ، لیکن اس شرط پر کہ اس کہانی کو المناک انجام سے بچاؤ گے۔ چڑیا یوں مخاطب ہے:

> ”تم ہمیشہ المناک کہانیاں لکھتے ہو، اداس کہانیاں۔ تمہاری کہانیوں کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوں تو تمہیں مزہ ہی نہیں آتا۔ تم اذیت، پسند ہو، تمہاری ہر کہانی میں موت خوبصورت محبوبہ کی طرح بال کھولے بیٹھی رہتی ہے۔ تمہیں موت سے پیار ہے۔

تم اپنی خود کشی کے لئے راہ ہموار کرتے رہتے ہو۔"(۶۷)

مظہر الاسلام کی کہانیوں کے کردار محبت کے متلاشی ہیں، لیکن زمانے کی سختیوں، مایوسیوں اور نا قابل برداشت درد محسوس کرتے ہوئے اس وجود سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسانہ تتلی کا کردار مالی بھی خود کشی کرلیتا ہے اسے آندھی سے خوف آتا تھا۔اسے ڈر تھا کہ کہیں پھولوں کی پتیاں بکھر نہ جائیں۔ مالی کو زندگی کے حادثات نے اُسے خوف میں مبتلا کر لیا تھا۔ وہ اس امر پر مجبور نظر آتا ہے کہ وہ اس دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرلے۔ مالی اپنے حالات زندگی بیان کرتا ہے

"مالی نے بتایا تھا جب وہ چھوٹا سا تھا تو اس کی ماں مر گئی اور جب وہ تھوڑا سا بڑا ہوا
اور کام میں باپ کا ہاتھ بٹانے لگا تو اس کے باپ نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔"(۶۸)

اس کی اپنی زندگی غیر آباد اور جنگل کی مانند تھی جس سے کنارہ کشی کے لیے اس نے خود کشی کا راستہ چنا۔ افسانہ پنجرہ، کا کردار بھی اداسی اور تنہائی سے تنگ آکر خود کشی کرلیتا ہے۔اس کی خود کشی کے پردہ محرکات اس کا حساس پن تھا جو معاشرے کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کر لیتا تھا اور ان کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کہانی سے روٹھا ہوا کردار، فسانہ میں بوڑھا اپنی موت پر مطمئن نظر آتا ہے اور اس موت کو خوشی سے قبول کرتا ہے۔ اپنی موت کا منتظر دکھائی دیتا ہے۔ پت جھڑ، کا بنیادی کردار اپنے تخیل میں خود کشی کر لینے کے بعد اپنی کہانی یوں بیان کرتا ہے:"مجھے خود کشی کیے ابھی صرف ایک گھنٹہ ہوا۔" (۶۹) وہ خود کشی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے "مجھے انسان کے لئے خود کشی کرنا معمول کی بات لگتی ہے۔"(۷۰) گڑیا مرنے نہیں دیتی، کا کردار جو نابینا ہوتا ہے، خود کشی کے ارادے سے شہر کی سب سے اونچی بلڈنگ کا انتخاب کرتا ہے۔ حالات کے جبر نے جب زندگی میں کوئی کشش نہ چھوڑی تب انسان کے لیے خود کشی کے راستے کے سوا کچھ نہ تھا۔ مظہر الاسلام ان ادیبوں کو آئیڈیل تصور کرتے ہیں جنہوں نے جوانی میں خود کشی کرلی۔ مظہر الاسلام لکھتے ہیں:

" آج بھی خود کشی کرنے والی امریکی شاعرہ سلویا پلاتھ، ایم سیکسٹن اور
سکنڈے نیویا کا ڈرامہ نگار ڈیگرمین میرے آئیڈیل ہیں۔ جنہوں نے

زندگی کے عروج کے دنوں میں خودکشی کرلی تھی۔"(۷۱)

مظہر الاسلام کی کہانیوں میں موت کے لیے بے پناہ کشش دکھائی دیتی ہے ان کے اندر ایسی دنیا پانے کی طلب جو آنکھوں سے اوجھل ہے۔ ۔مظہر الاسلام نے جس عہد میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا اس زمانے میں ہی وجودیت کی تحریک بھی اردو ادب میں آئی۔دیگر تحریکوں کی طرح اس کا تعلق بھی مغرب سے ہے اس نے بحران زدہ انسان کے مسائل پر بحث کی فرد کی انفرادیت پر زور دیا اور داخل کی طرف رجوع کیا۔اس تحریک نے صنعتی ترقی کے باعث پھیلنے والی تنہائی اور اداسی کو موضوع بنایا اگرچہ مغربی مفکرین کے ہاں اس کی کوئی یکجا صورتحال نظر نہیں آتی ناقدین کی آراء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔مغرب میں اس کے زیر اثر لکھا جانے والا ادب۔مایوسی و اداسی، تنہائی کرب اور لایعنیت جیسے عناصر سے بھرا ہوا ہے۔

مغربی وجودیت کے چند ایسے مباحث تھے جن کو مشرق میں پذیرائی نہ مل سکی جن میں ایک خدا سے انکار اور مایوسی ناامید ہے ۔داخل کی طرف توجہ مشرق میں پہلے سے ہی موجود تھا لیکن اس تحریک کے ذریعے اسے مزید فروغ ملا ادب میں خارجی حالات کے ساتھ ساتھ داخل کو بھی موضوع بنایا جانے لگا۔مظہر الاسلام کے افسانوں میں بھی اس تحریک کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس کے علاوہ ملک کی صورتحال ایسی ہی تھی جس کو وجودیت کے محرکات میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ملک پاکستان تاریخ کے نازک ترین دور سے گزر رہا تھا، تقسیم کے بعد پاکستان میں وہ امن و سکون میسر نہیں تھا اور نہ ہی وہ آزادی تھی جن کی بنیادوں پر اسے ایک الگ مملکت کی حیثیت ملی تھی ملک میں افراتفری کا عالم تھا مادیت پرستی کا رجحان تھا۔

مظہر الاسلام نے اپنے اردگرد کے حالات کو افسانوں کا موضوع بنایا ان کے ایک کردار بے نام ہیں علامتی انداز میں صورتحال پر طنز ملتا ہے۔مظہر الاسلام کے افسانوں میں وجودی کرب ہے کردار خود کو ایک قیدی تصور کرتے ہیں۔وہ اس دنیا کو دکھوں کا گہوارہ سمجھتے ہیں۔ موت اور خودکشی کا ذکر ان کے ہاں مسلسل ملتا ہے۔ خودکشی مظہر الاسلام کا من پسند موضوع ہے جو مغربی وجودیت کا اہم عنصر ہے وجودیت موت کو زندگی کے لیے بے مقصد سفر تصور کرتی ہے اور یہی صورتحال مظہر الاسلام کے افسانے میں بھی نظر آتی ہے۔کردار اپنے وجود کو ایک پنجرہ سمجھتے ہیں جس میں وہ مقید ہیں۔تنہائی اداسی کو روح کی غذا سمجھتے ہیں اور اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ہر طرف خوف کی فضا تھی کرفیو نافذ تھا جس کے باعث شہریوں پر ظلم و ستم کیا جارہا تھا مظہر

الاسلام نے ان بدترین حالات کی عکاسی اپنے افسانوں میں کی ہے اور اس دور کے بحران زدہ انسان کے مسائل کو بیان کیا ہے۔

ستر کی دہائی میں پاکستان کے حالات نے بھی انسان کو ٹوٹ پھوٹ کا شکار کر دیا تھا انسان اندرونی طور پر بکھر چکا تھا قدم قدم پر حقوق کا غضب، پولیس کے عائد کردہ جھوٹے الزامات آزادی رائے پر پابندی، کمزور طبقے کا استحصال، سب ایسے مسائل تھے جنہوں نے انسان کو تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس دور کا انسان مایوسی کا شکار ہے اور ایک پرامن معاشرے کی تلاش میں ہے کئی کردار اپنے پرانے شہر کی تلاش میں ہیں۔ سماج میں پھیلی برائیاں مظہر الاسلام کو اندر تک زخمی کرتی ہیں وہ معاشرے کے حساس طبیعت انسانوں میں سے ہیں جو کہ معمولی سی بات کو بھی بڑی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ معاشرے کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کو گہری چوٹ پہنچاتی ہے انھوں نے ان بدعنوانی کو موضوع بنایا ہے جنہوں نے انسان کو بے حسی کا شکار کر دیا۔ وہ بارہا اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ معاشرہ خوشامد اور رشوت جیسے زہر سے بھر چکا ہے جھوٹ، منافقت کا دور دورہ ہے۔ انسان دوسرے انسان کو دھوکا اور فریب دینے میں مبتلا ہے انسان ایک دوسرے کی جانوں کا دشمن ہے ایسے معاشرے میں ایک حساس شخص کا نارمل زندگی گزارنا مشکل ہے۔

مظہر الاسلام کے بقول وہ ایک نارمل انسان کی طرح زندگی نہیں گزار سکتے وہ معاشرے کی برائیوں اور ناانصافیوں کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور انسان کے داخل کی صورتحال کو زیر بحث لاتے ہیں۔ کشمکش کی اس صورتحال میں ان کو زندگی گزارنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا کو لغو تصور کرتے ہیں اور زندگی کو دکھوں کی بیل گاڑی قرار دیتے ہیں یہی موضوعات مظہر الاسلام کے افسانے کو وجودیت سے قریب تر کرتے ہیں۔

اعلی حکام غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں کے ساتھ ناروا سلوک برتتے تھے کمزور کے حقوق کی پامالی کی جاتی تھی۔ سارتر ان طبقاتی نظام اور استحصالی نظام کے خلاف تھا۔ مظہر الاسلام بھی اس نظام پر کڑی تنقید کرتے ہیں ان کے افسانوں میں جاگیردارانہ نظام کے خلاف احتجاج ملتا ہے معاشرے میں پھیلی ان بیماریوں کے باعث ان کے کردار گھٹن اور وحشت کا شکار ہوتے ہیں وہ ایسی فضا میں سانس لینا دشوار محسوس کرتے ہیں جہاں لوگوں کو بندوقوں کے بٹ مار مار کر نچایا جا رہا ہوتا ہے اور ان پر طرح طرح کی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ مظہر الاسلام اس

بات کے خلاف نظر آتے ہیں کہ اگر انسان آزاد پیدا ہوا ہے تو اس پر دوسرا انسان کیسے فیصلے صادر کر سکتا ہے۔ بغیر کسی جرم کے لوگوں کو جیل جانا پڑتا تھا اور سزا سہنی پڑتی تھی ہزاروں قیدی ایسے تھے جن کو اپنے جرم کا بھی علم نہیں تھا ہر طرف پولیس کا خوف، بم دھماکوں کی خوفزدگی نے لوگوں کو اندر سے تنہا اور کھوکھلا کر دیا۔ احتجاج کرنے یا آواز بلند کرنے پر پابندی تھی ایسے معاشرے میں لوگوں کا نفسیاتی اور ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہونا ایک فطری امر ہے۔ مظہر الاسلام کے کردار بھی اس نفسیاتی الجھن کا شکار ہیں وہ نفسا نفسی کے اس عالم میں یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ وہ کیا ہیں؟ اور ان کی زندگی کا کیا مقصد ہے؟

داخلیت کی طرف رجحان نے انسانوں کو اپنے آپ کو پہچاننے کی طرف متوجہ کیا۔ خود آگاہی اور خود شناسی کے ذریعے ہی انسان اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے اور وہ اپنی اصل اس کو تلاش کر سکتا ہے۔ مظہر الاسلام کے کرداروں کے اندر یہ جذبہ بھی دکھائی دیتا ہے وہ سلوک کی بارش کے متلاشی ہیں، طلب کی پیاس ہے۔ وہ سلوک کو روح کا عروسی جوڑا قرار دیتے ہیں۔ مظہر الاسلام نے داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر سچ کو تلاش کیا ہے وہ سچ کہنے اور سننے کے عادی ہیں۔ وہ خارجی سچائی کو بھوک، پیاس اور غربت میں تلاش کرتے ہیں جبکہ داخلی سچائی کو عبادتوں کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

مظہر الاسلام کے کردار تنہا پسند ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر اجتماعی احساس کا جذبہ بھی رکھتے ہیں ان کو اپنی ذات سے باہر دوسرے لوگوں کی فکر بھی لاحق ہوتی ہے وہ ان لوگوں کے لیے بھی پریشان ہیں جو اپنے حقوق کے غضب ہونے پر کسی غم کیا دکھ کا اظہار نہیں کرتے۔ اجتماعی زندگیوں کا دکھ بھی محسوس کرتے ہیں جو کہ کسی بے مقصد جنگوں کے نام ہو گیئں اور اپنی شناخت کھو گئیں۔ وہ شہریوں کی ٹوٹی اور بکھری ہوئی خواہشات کو بھی سمیٹنا چاہتے ہیں وہ دنیا کو دکھوں سے آزاد کرنا چاہتے ہیں۔

مظہر الاسلام کے افسانے میں میں ڈر اور خوف کی زندگی گزارنے کے خلاف بھی احتجاج بھی نظر آتا ہے اور کسی کے ہاتھوں مرنے سے اپنی موت آپ مرنے کے کے قائل ہیں۔ پابندی اظہار کے خلاف بھی شدید احتجاج نظر آتا ہے وہ اپنی آواز میں گم ہونے کی شکایت کرتے ہیں اور اخباروں کو محض کچرے کا ڈھیر تصور کرتے ہیں ان پر خبروں سے بدبو کے بھبھوکے اٹھ رہے ہیں۔ اگرچہ احتجاج بآواز بلند نہیں ہے لیکن علامتی انداز میں ان تمام مسائل پر کڑی تنقید ملتی ہے۔ وجودیت بنیادی طور پر ایک قنوطیت زدہ رویہ ہے جس میں

مایوسی ،اداسی، بے چارگی، لایعنیت، جیسے عناصر شامل ہیں۔ مشرق میں اس کی شکل قدرے بدلی ہوئی ملتی ہے اس کے باعث مشرقی وجودیت کے زیر اثر لکھا گیا ادب یکسر قنوطی نہیں ہے چند عناصر ایسے بھی ہیں جو امید کی طرف لے جاتے ہیں مظہر الاسلام کے افسانے میں بھی چند رجائی وجودی عناصر بھی موجود ہیں، رجائی عناصر کی نسبت قنوطی عناصر زیادہ ملتے ہیں جو مغربی وجودیت سے زیادہ قریب تر کرتے ہیں اس کے علاوہ مظہر الاسلام مغربی وجادی مفکر کافکا سے بھی متاثر نظر آتے ہیں اور اس کے اثرات ان کی تحریروں میں بھی ملتے ہیں۔

## حوالہ جات


۱۔ مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی (افسانوی مجموعہ)، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۲، ص ۶۳

۲۔ صفیہ عباد، ڈاکٹر، کہانی مظہر الاسلام ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۷

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، علامتی افسانہ ایک منفی رجحان، مشمولہ سوال یہ ہے، بیکن بکس ملتان، ۲۰۰۴، ص ۱۴۱

۴۔ صفیہ عباد، ڈاکٹر، کہانی مظہر الاسلام ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۷

۵۔ مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی (افسانوی مجموعہ)، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۲، ص ۱۶

۶۔ ایضاً، ص ۱۸

۷۔ ایضاً، ص ۳۱

۸۔ ایضاً، ص ۳۳

۹۔ ایضاً، ص ۳۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۴۱

۱۳۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی (افسانوی مجموعہ)، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۷، لاہور ص ۱۱

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۱۵۔ ایضاً۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۲۰۔ مظہر الاسلام، گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو (افسانوی مجموعہ)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱، ص ۶۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۵۰

۲۲۔ مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، ص ۱۳۳

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۳۴

۲۴ ایضاً، ص ۱۳۵

۲۵۔ مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، ص ۱۴۶

۲۶۔ مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، ص ۵۲

۲۷۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص ۱۱

۲۸۔ مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، ص ۳۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۳۲

۳۰۔ ایضاً، ص ۳۵

۳۱۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص ۱۱

۳۲۔ مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، ص ۳۱

۳۳۔ مظہر الاسلام، گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو، ص ۸۹

۳۴۔ ایضاً، ص ۹۰

۳۵۔ ایضاً، ص ۹۱

۳۶۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص ۸۰

۳۷۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص ۸۰َ

۳۸۔ ایضاً، ص ۵۳

۳۹۔ ایضاً، ص ۵۴

۴۰۔ ایضاً، ص ۵۴

۴۱۔ مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، ص ۱۲۲

۴۲۔ مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، ص ۱۲۲

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۴۴۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص ۷۷

۴۵۔ ایضاً، ص ۸۰

۴۶۔ ایضاً، ص ۳۴

۴۷۔ ایضاً، ص۳۸

۴۸۔ ایضاً، ص۳۷

۴۹۔ ایضاً، ص۳۸

۵۰۔ ایضاً، ص۳۹

۵۱۔ ایضاً، ص۷۸

۵۲۔ مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، ص۱۲۹

۵۳۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص ۳۴

۵۴۔ ایضاً ، ص۳۵

۵۵۔ ایضاً، ص۳۶

۵۶۔ ایضاً، ص۳۶

۵۷۔ ایضاً، ص۳۶

۵۸۔ مظہر الاسلام، گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو، ص۱۲۰

۵۹۔ ایضاً، ص۱۲۲

۶۰۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص۳۶

۶۱۔ ایضاً، ص۳۷

۶۲۔ ایضاً، ص۹۳

۶۳۔ ایضاً، ص۱۰۲

۶۴۔ ایضاً، ص۱۴۷

۶۲۔ ایضاً، ص۱۴۸

۶۵۔ ایضاً، ص۱۴۸

۶۶۔ صفیہ عباد، ڈاکٹر، کہانی مظہر الاسلام ہے، ص ۶۵

۶۷۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص۶۶

۶۸۔ ایضاً، ص ۷۲

٦٩۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۷۰۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۷۱۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص ۲۴

باب سوم

# احمد جاوید کے منتخب افسانوں کا مطالعہ

## تعارف

احمد جاوید کا شمار پاکستان کے معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے اور ۲۰۱۷ء میں اسلام آباد میں وفات پائی۔ پاکستانی تاریخ کے بدلتے منظر نامے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا انھوں نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی وہ سیاسی اور معاشی ابتری کا شکار تھا۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے پر پابند سلاسل جیسی سزائیں عائد کر دی جاتی تھیں سیاسی جبر نے لوگوں سے حق آزادی چھین لیا تھا۔ ان حالات میں احمد جاوید نے علامتی اور تمثیلی انداز میں ملک کے سیاسی اور معاشرتی ناہمواریوں کو موضوع بنایا اور ملکی حالات پر شدید طنز کیا۔ اقبال آفاقی لکھتے ہیں

"احمد جاوید حقیقت کے وسیع تر کشف کے روبرو کھڑا ہے جس کے سبب
اسے بہت سی چیزوں کو نہ صرف از سر نو مرتب کرتا ہے بلکہ فرد، سماج
اور کائنات کی تثلیث کو نئے آئینوں میں دیکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔"(۱)

احمد جاوید ستّر کی دہائی کے ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ ان کی پہلی کہانی ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی لیکن ستر کی دہائی میں احمد جاوید کی واضح پہچان بنی۔ اس دہائی میں جہاں اہم تبدیلیاں ہوئیں وہاں افسانے کو بھی نئے موضوعات فراہم ہوئے۔ ملک سیاسی، معاشی اور طبقاتی کشمکش کے بدترین دور سے گزر رہا تھا۔ سقوط ڈھاکہ، مارشل لاء اور تقسیم کے بعد لوگوں کے مسائل، جیسے بحران کا شکار معاشرہ تھا جہاں نفسا نفسی کا عالم کا تھا اظہار بیان پر پابندی تھی ایسے حالات میں ادیبوں نے اپنے معاشرے کے مسائل کو رمزیہ انداز میں تحریر کیا۔ یوسف حسن احمد جاوید کی افسانہ نگاری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں

" احمد جاوید اردو افسانے کی روایت میں ایک منفرد افسانہ نگار ہے۔ اتنا منفرد کہ اس کے

افسانے پڑھتے ہوئے کوئی دوسرا نام ذہن میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"(۲)

افسانہ اپنا مواد معاشرے سے لیتا ہے لہٰذا ایسے تمام مسائل جن سے معاشرہ دوچار تھا وہ افسانے کا موضوع بنے۔ نئے نئے موضوعات افسانے میں در آئے۔ احمد جاوید کے تین افسانوی مجموعے ہیں۔ غیر علامتی کہانی، ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا اس میں ۱۹۷۷ء کے بعد کے افسانے ہیں۔ زیادہ تر افسانوں کی فضا میں گھٹن اور خوف طاری ہے۔ دوسرا افسانوی مجموعہ گمشدہ شہر کی داستان ہے اس میں پندرہ افسانے شامل ہیں ہر افسانہ سماجی احوال کی ترجمانی کی کوشش کرتا ہے۔ تیسرا افسانوی مجموعہ چڑیا گھر ہے اس میں موجود افسانوں کے عنوانات جانور اور حشرات الارض ہیں اس میں سقوط ڈھاکہ اور مارشل لاء کے باعث پھیلی وحشت اور گھٹن کو موضوع بنایا گیا ہے

ادیب معاشرے کا ایک حساس شخص ہوتا ہے اور سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کو وہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔ احمد جاوید نے بھی اپنے معاشرے میں ہونے والے تمام مسائل کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور ان کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ معاشرہ جو شدید حساس اور نازک کیفیات سے گزر رہا تھا اور خارجیت کو چھوڑ کر داخل کی طرف رجحان تھا اس کے ساتھ ہی علامتی افسانے کا آغاز بھی ہوا افسانے میں نئے موضوعات در آئے اور نئی کہانی نے جنم لیا۔ دراصل یہ نئی کہانی ایسے انسان کی کہانی تھی جس نے داخل کو موضوع بنایا اب خارج کے ساتھ افسانے میں داخلی زندگی کی عکاسی بھی نظر آنے لگی۔ داخل کی طرف متوجہ کرنے والے عوامل میں مشینی ترقی بھی ہے جس نے انسان کے وجود کو مٹا دیا اور انسان اپنی پہچان کی تلاش میں گم ہونے لگا۔ اس ترقی یافتہ دور نے انسان کو کرب میں مبتلا کیا کر دیا۔ سلطان علی شیدا اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں

"وہ انسانوں کی بھیڑ میں اپنی زندگی کی معنویت اور انفرادیت پر جب غور
کرتا ہے تو اسے سخت مایوسی ہوتی ہے۔ وہ خود کو گم شدہ تصور کرتا ہے نتیجے
کے طور پر زندگی اس کے سامنے ایک سوالیہ نشان قائم کرتی ہے۔"(۳)

احمد جاوید کے افسانوں میں بھی نئے موضوعات نے جنم لیا۔ اس دور کے مسائل کے خلاف احتجاج بھی نظر آتا ہے اگرچہ رمزیہ اور علامتی انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ احمد جاوید کے افسانوں میں حالات کے مارے ہوئے انسانوں کا دکھ ملتا ہے، اجتماعی اور انفرادی زندگی دونوں کے مسائل کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے حشرات الارض اور جانوروں کو علامات کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تہہ داری کے باوجود علامات قابل تفہیم

ہیں۔ سیاسی، سماجی اور نفسیاتی غرض زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ یوسف حسن، احمد جاوید کے افسانوں کے متعلق لکھتے ہیں

> ”یہ کہانیاں دراصل ان زندہ افراد کے مرثیے ہیں جو اندر سے ٹوٹ چکے ہیں
> اور ایک ایسی فضا میں سانس لے رہے ہیں جہاں قدم قدم پر تبدیلی کی
> خواہش سر اٹھاتی ہے اور یوں زندگی کے رنگا رنگ پہلو افسانے کے دامن
> میں سمٹ آتے ہیں۔“(۴)

ذیل میں احمد جاوید کے چند منتخب افسانوں کا وجودیت کے تناظر میں جائزہ لیا جائے گا۔احمد جاوید کے افسانوں میں عصری مسائل، سیاسی تنزلی کے ساتھ ساتھ وہ پرامید بھی ہیں۔کشیدہ حالات کے باعث جہاں ہر طرف نا امیدی نے ڈیرے ڈالے وہیں امید بھی دلاتے ہیں جو انسان کو زندگی سے بیزار ہونے کے بجائے اچھے وقت کا انتظار اور جدوجہد پر آمادہ کرتی ہے۔

## ا۔ احمد جاوید کے افسانوں میں رجائی وجودی عناصر

### خود آگہی

دنیا کی گہما گہمی اور افراتفری نے انسان کی اپنی شناخت کو مسخ کر دیا۔ جہاں انسانوں کا ہجوم ہر طرف دھکم پیل اور انسان اپنا اصل مقام جہاں کھو چکا ہو وہاں اس کے لئے صرف ایک ہی راستہ بچتا ہے کہ وہ اپنے آپ کے بارے میں پہچانے کیا ہے کہ وہ کیا ہے؟ایسی صورتحال جس میں انسان کی پہچان صرف ہاتھ پاؤں تک رہ جائے وہاں ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی ایسا راستہ اختیار کیا جائے جہاں سے انسان اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ بحال کر سکے اور خود کو تحفظ فراہم کر سکے۔

احمد جاوید نے اپنے افسانوں میں خود آگہی کی طرف توجہ دلائی۔ جنگل جانور، آدمی ایسا ہی افسانہ ہے جس میں ایسے معاشرے کی مثال بیان ہے جہاں ہر طرف خود غرضی ہے،انسان ایک دوسرے کو روندتے ہوئے چلے جارہے ہیں۔انسان، انسان کی عزت و تکریم کرنا بھول گیا ہے ایسے حالات میں وہ یہ سوچنے پر مجبور ہے کیا میں انسانوں کے درمیان ہوں یا درختوں کا جنگل ہے۔ دراصل وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کیا یہ انسان ہیں یا درخت

جو صرف ساکن و ساکت کھڑے نظر آتے ہیں۔ خود آگہی کے لیے تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسی خاموشی درکار ہوتی ہے جہاں ہلکی سی آہٹ کو بھی محسوس کیا جاسکے۔

مذکورہ بالا افسانے کا کردار بھی ایسی ہی خاموشی کا متلاشی نظر آتا ہے جہاں وہ یہ معلوم کر سکے کہ وہ کس معاشرے میں زندگی گزار رہا ہے۔ اصل میں دنیا کے ہجوم نے اس سے اپنی زندگی کی معنویت چھین لی ہے اس کی قیمت بھی صرف درختوں تک محدود ہو گئی ہے۔ انسان کو اپنے آپ تک پہنچنے کے لیے یا اپنی شناخت حاصل کرنے کے لیے باہر کی دنیا کو خیر باد کہنا پڑتا ہے اور اندر کی دنیا کو آباد کرنا پڑتا ہے۔ جنگل، جانور، آدمی کا مرکزی کردار بھی اپنی اندر کی دنیا کو بساتا ہے اور اسے ایک جنگل کی مانند قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے داخل کی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے۔ ”تو جوں جوں آگے جاؤ گے جنگل خود تمہارے اندر داخل ہونے لگے گا۔“(۵) انسانوں کے ہجوم میں اسے یہ خوف محسوس ہونے لگا کہ کیا وہ انسان ہے یا درخت یا اس کے ارد گرد آدمی ہیں یا درخت حقیقت میں وہ آدمیوں کے درمیان روندھا ہوا شخص تھا جو خود کی تلاش میں اس راہ پر چل پڑا تھا ظاہری دنیا کی جو چیزیں ہمیں دکھائی دیتی ہیں وہ ہمیں اتنی ہی نظر آتی ہیں جتنی کہ ہماری ظاہری آنکھ احاطہ کر سکتی ہے۔ احمد جاوید کے افسانے، باہر والی آنکھ، میں لکھتے ہیں

> ”باہر سے اندر جھانکنے والوں کو اتنا ہی دکھائی دیتا ہے جتنا کہ ان کی آنکھ احاطہ کر سکتی ہے۔
> مگر ہر آنکھ کے پیچھے ایک اور آنکھ ہوتی ہے جو اس سے زیادہ دیکھتی ہے جتنا کہ نظر آتا ہے۔“(۶)

انسان کو اپنے اندر جھانکنے کے لیے ظاہری آنکھ سے نہیں بلکہ باطنی آنکھ سے دیکھنا ضروری ہے تاکہ اسے حقیقت کا ادراک ہو سکے۔ انسان جب انجانی چیزوں سے آشنائی حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ ہر طرح کے مصائب کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے خود کو فراموش کر دیتا ہے۔ داخل کی دنیا جو اسے سکون فراہم کرتی ہے وہ اسے کبھی خارجی دنیا سے حاصل نہ ہو سکا۔ افسانہ چڑیا، جو اپنی تلاش میں ہے

> ”موسم کچھ ٹھیک نہیں تھا مگر اس تنہا چڑیا کو شاید ہوا سے کھیلنا مرغوب ہوا تھا۔
> حالانکہ سر پھری ہوا کا کیا اعتبار۔ اس سے کیا کھیلنا، مگر وہ جو تنہا ہو گئی تھی اپنا

آپ فراموش کر بیٹھی تھی۔ اسے اس ان دیکھی انجانی ہوا سے کچھ تعلق ہو گیا
تھا۔ وہ شاید دیکھنا چاہتی تھی، جاننا چاہتی تھی محسوس کرنا چاہتی تھی۔"(۷)

احمد جاوید کے مطابق انسان کا ضمیر ایک چڑیا کی مانند ہے جو بند کمرے میں ہو۔ وہ اپنی آواز کی بازگشت پر فیصلہ نہیں کر پاتا یہ اندر سے آواز آئی ہے یا باہر سے۔ انسان نے اپنی شناخت کا عمل تب شروع کیا جب اس نے موجودہ دنیا میں اپنا آپ گم ہوتا دیکھا۔ احمد جاوید اس دور کے انسان کی داخلی کیفیات کو بیان کیا ہے جس میں وہ دنیا کی بھاگ دوڑ میں اس قدر مصروف تھا اور اپنی ہی ذات سے ناواقف تھا۔ مارشل لاء اور سیاسی ابتری کی وجہ سے انسان کی زندگی صرف خبروں تک محدود ہو گئی تھی۔ اور زندگی کا تسلسل ٹوٹتا ہوا نظر آرہا تھا جیسے سائیکل سوار کا چین بار بار ٹوٹنے سے سائیکل رک جاتی ہے۔ بند آنکھوں کے پیچھے، میں ایسی ہی ایک آدمی کی کہانی ہے۔ اس افسانے میں زندگی کی اصل حقیقت کی طرف اشارہ ملتا ہے جو کہ ناگہانی صورتحال کے باعث ایک عجب موڑ پر آکھڑی تھی۔ انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر وہ کون ہے؟؟ اور اسے اس دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟ افسانے کا کردار یہ کہتا ہے

"جب میں رکتا ہوں تو سلسلے ٹوٹ جاتے ہیں اور میں بھول جاتا ہوں کہ میں کون ہوں؟
صدا لگاتا ہوں تو کہیں سے ایک ہجوم نمودار ہوتا ہے اور میرے ساتھ مل کر صدا
لگاتا ہے ہم کون ہیں؟ ہم سب کے لئے کچھ بھی نہیں۔" (۸)

وہ خوابوں کی دنیا میں رہنا پسند کرتا ہے

"سوچنے والوں کے لیے تو کچھ بھی نہیں مگر ان کی آنکھیں۔۔۔۔۔۔ جام جمشید آنکھیں۔
تو ہمارے لیے سب کچھ بند آنکھوں کے پیچھے ہے ہم آنکھیں کھولتے ہیں خوابوں کا حصار
توڑ دیتے ہیں۔"(۹)

احمد جاوید معاشرے کی بے حسی پر طنز کرتے نظر آتے ہیں جس میں انسان نے خود کو بھلا کر زندگی گزارنا شروع کر دی اور وہ کہتے ہیں کہ آنکھیں بند کر کے اور خود سے ناآشنا رہ کر ہر قسم کی زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ کیوں کہ جس معاشرے میں انسان کی زندگی کی کوئی اہمیت نہ ہو، قتل عام ہو انسان پر ظلم و ستم ہو رہے ہو تو وہاں آنکھیں بند کر کے ہی رہا جاسکتا ہے۔ ایک حساس شخص کے لئے ان چیزوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا کسی

اذیت سے کم نہیں ہے ان حالات میں خود کو تلاش کرنا ہی مسائل کا حل ہے انسانی زندگی کیا ہے؟ اس دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جو انسان کو اپنی تلاش میں نکلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مذکورہ بالا افسانے کا کردار کہتا ہے ''ہم تو خود کو تلاش کرتے ہوئے گلیوں اور سڑکوں پر پھیل جاتے تو ہمارے چاروں طرف اندھیرا ہوتا کہ بند آنکھوں سے باہر اندھیرا ہی تو ہے۔''(۱۰) افسانہ آکاس بیل کا کردار بھی اپنے اندر ایک طوفان برپا دیکھتا ہے۔ اسے اپنے اندر کی آواز یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ تم کون ہو؟ اور کیا یہ تمام منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ دھماکے، لڑائی اس سب کو آنکھوں دیکھنا اور چپ چاپ رہنا زندہ ضمیر والوں میں بہت کم مدت تک ایسا ہوتا ہے۔ آخر کار ان کا ضمیر ان کو جاننے اور اپنی اصلیت کی تلاش پر مجبور کر دیتا ہے۔ آکاس بیل کا کردار بھی ایسے ہی مسائل کا سامنا کرتا ہے اور فیصلہ نہیں کر پاتا کہ یہ آواز اندر سے ہے یا باہر سے۔

''وہ پوچھتا ہے کون؟ جواب آتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ میں!
میں؟؟۔۔۔۔۔ میں تو ادھر ہو دروازے کی اس طرف
یہ دوسرا کون ہے؟ اور کیوں دستک دیتا ہے؟''(۱۱)

دنیا کی چکا چوند نے انسان کو اپنی طرف موڑ لیا جب وہ اس دنیا کے ہجوم سے تنگ آ گیا تو اس نے سکون کی تلاش کی اور سکون صرف اندر کی دنیا میں ہی میسر آیا۔ احمد جاوید کے بیشتر افسانوں کے کردار اسی سکون کی کوشش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ وہ دنیا کی دھکم پیل سے تنگ کر ایسی جگہ کے متلاشی نظر آتے ہیں جہاں رہ کر وہ اپنے بارے میں جان سکیں۔ مشینی زندگی نے انسان سے اس کی حقیقت کو چھین لیا۔ دن رات ذمہ داریوں کے بوجھ تلے وہ مشین بن کے رہ گیا۔ افسانہ بیمار کی رات، میں مرکزی کردار اپنے اندر کی دنیا بسانا چاہتا ہے۔ وہ اس گھر کے زنگ آلود تالے کو کھولنا چاہتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے

'' اندر وہاں اس گھر میں تنہائی نے کیڑے مکوڑوں کی خاطر جالے بن رکھے ہوں گے۔ دیواروں کا پلستر اکھڑ چکا ہو گا اور ان پر چھپکلیاں رینگتی ہوں گی سب کچھ ویسا ہو گا جیسے بند گھروں میں ہوتا ہے کہ وہ گھر میں مدت سے بند ہے وہاں تالا پڑا ہے۔ یہی تالا۔۔۔ یہی زنگ آلود تالا اس کے اجاڑپن کی علامت ہے''(۱۲)

آخر کار اس نے اپنے اندر کے اس زنگ آلود تالے کو کھول لیا۔

"تو اس نے گھبرا کر نعرہ مستانہ بلند کیا اور گریبان چاک کیا۔ دامن تار تار ہوا
تو حیرت ہوئی کہ دروازے کے پٹ واہ تھے۔ بھید افشاء تھا تو اس نے گریبان
چاک کرنے اور اس گھر میں داخل ہونے سے پہلے جو سوچا ہوتا تھا وہ گمان تھا۔"(۱۳)

وہ اپنے اندر داخل ہونے سے پہلے جس قسم کے خیالات رکھتا تھا اپنے اندر کی دنیا کے لیے وہ صرف اس کا گماں نکلے۔ حقیقت میں ایسا کچھ نہ تھا وہ اس بات پر پچھتا رہا تھا کہ مدتوں تک وہ اس گھر سے باہر کیوں رہا۔ اس گھر میں داخل ہونے کے بعد اسے جو سکون محسوس ہوتا ہے وہ یوں بیان کرتا ہے

"تو جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اسے کچھ سکون ملا کہ یہاں پر فرش خوب
ٹھنڈا تھا، خوب خنک تھا اور چھت بلند تھی تو ایسا تھا جیسے وہ سوچتا تھا اور
ویسا نہ تھا جس کا وہ گمان کرتا تھا۔"(۱۴)

خود آگہی ہی انسان کو سکون بخشتی ہے دنیا کی تمام تکلیفوں سے آزاد کرنے کا عمل خود آگہی ہے۔ خود کو جانے بغیر انسان اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔ خود کو پہچانا اپنے رب کو پہچانا ہے۔ اسی عمل کے ذریعے انسان دنیا کی حقیقتوں سے آشنا ہوتا ہے۔

### امید

وجودیت کا آغاز مغرب سے ہوا اور مغربی وجودیت کے مطالعے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے وجود کو ایک پھندا تصور کرتے ہیں اور اس سے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ مغربی وجودی مفکریں حالات یا مصائب کا دلیری سے سامنا نہیں کرتے بلکہ وہ نا امیدی کے ساتھ خود کو اس دنیا میں بوجھ تصور کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں وجودیت کے زیر اثر ادب تخلیق کیا گیا لیکن نا امیدی کے عنصر کو غالب نہیں آنے دیا ہمارے مذہب میں نا امیدی گناہ ہے۔ اس لئے اچھے وقت کا انتظار کرنے کا درس دیا گیا۔ ہمارا ملک جن مسائل سے دوچار تھا ان سے نا امیدی ہی جنم لے سکتی ہے لیکن احمد جاوید نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنے اور اچھے وقت کی آمد کی یقین دہانی کرائی۔ احمد جاوید ان ادیبوں میں شمار ہیں جن کے افسانوں میں قنوطی وجودی عناصر کے ساتھ ساتھ ایک اہم رجائی عنصر بھی دکھائی دیتا ہے۔ مارشل لاء کی

پابندیوں کے باعث لوگ خود کو غلام سمجھ رہے تھے اور ہر شخص یہی سوچ رہا تھا کہ وہ قیدی ہے جنگل، جانور، آدمی ، افسانے میں ایک ایسے جنگل میں رات گزار رہا ہوتا ہے۔ جہاں وہ درختوں اور آدمیوں میں فرق محسوس نہیں کر پاتا۔ آدمی ہیں یا درخت۔ لیکن ان کی صدا کہ ہمیں آزاد کر دیا جائے۔ حقیقت میں وہ سیاسی مسائل میں گھرا ہوا آدمی تھا۔ جسے دوسرے آدمیوں کے ہجوم کچل ڈالا تھا۔ اس دور کے مسائل نے اسے ہر طرف سے ناامید کر لیا تھا اسے ہر طرف اندھیرا ہی نظر آتا تھا ہر طرف ظلم کی رات تھی لیکن احمد جاوید نے ان حالات کے باوجود امید دلائی کہ وقت نے گزرنا ہوتا ہے احمد جاوید لکھتے ہیں

"کوئی ہے جو ہمیں خرید کر آزاد کر دے۔ وہ ان میں پھنسا ہوا تھا مگر
رات ڈھل رہی تھی۔ رات کو ڈھلنا ہوتا ہے۔ صبح طلوع ہوتی ہے۔"(۱۵)

ظلم اور اندھیری رات زیادہ دیر تک نہیں رہتی۔ احمد جاوید کے افسانوں میں حبس کا موسم ہے۔ جو بہت دیر تک ایک جیسا رہتا ہے۔ اصل میں ان حالات کی طرف اشارہ ہے جو کئی سالوں تک ایک جیسے رہے۔ افسانہ آثار میں بھی حبس کا موسم ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اس رکے ہوئے موسم کی وجہ سے فضا میں گھٹن ہے۔ ایک طویل عرصے تک پابندیاں رہنے کے باعث انسان اس ماحول سے خوفزدہ ہو جاتا ہے اور تبدیلی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ لیکن جہاں بات کرنے پر بھی پابندی ہو وہاں تبدیلی کا کیا امکان موجود ہو سکتا ہے لیکن احمد جاوید امید کی نوید سناتے ہیں "میرے لیے ٹھہرے ہوئے، رکے ہوئے موسم درجہ حرارت کی کمی بیشی، آندھیاں، طوفان، بارشیں، سیلاب زلزلے، گلشیر اندیشے کا باعث ہیں۔" (۱۶) وہ پر امید ہیں کہ آخر موسم بدلے گا اور یہ حالات نہیں رہیں گے۔

"میں سنتا ہوں کہ گلیوں میں نو عمر بچوں میں اودھم مچا رکھا ہے کہ انہیں جھکے آتے
بادلوں سے بارش کی امید ہے توقع رکھنی چاہیے کہ موسم بدلے گا۔"(۱۷)

حالات کی بہتری کو خوشگوار موسم قرار دیتے ہیں مذکورہ بالا افسانے میں وہ لکھتے ہیں "ہوا تو ابھی چلنا شروع ہوئی مگر خنکی سی ہوتی جاتی ہے تبدیلی کا احساس پھیلتا جارہا ہے حبس ٹوٹ رہا ہے" (۱۸)

"گویا موسم بدلنے کا یقین ہوتا جاتا ہے۔ بلا آخر ایسا ہی ہونا تھا موسموں کو تو بدلنا
ہی ہوتا ہے۔ مگر جب وہ رت طول پکڑ جائے بس یوں ہی بے یقینی سے ہونے

لگتی ہے۔ جیسے سب کچھ ٹھہر گیا ہو اور کبھی نہیں بدلے گا"(۱۹)

احمد جاوید اس بات کی یقین دہائی کراتے ہیں کہ حالات کتنے ہی کٹھن کیوں نہ ہوں ایک جیسے نہیں رہتے وقت نے بدلنا ہوتا ہے لیکن امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ " امید رکھنی چاہیے کہ موسم کب بدلے گا کہ کچھ آثار بھی"(۲۰) دمدار ستارے افسانہ میں بھی علامتی انداز میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی جب حالات ویسے ہی تھے تب بھی وہ اچھے وقت کے منتظر دکھائی دیتے ہیں۔ سب کچھ بوسیدہ ہونے کے باوجود وہ مطمئن نظر آتے ہیں کیوں کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وقت بدلے گا۔

> "گلے کی کوئی بات نہیں، مگر امید ہے کہ ہمارے اختیار میں نہیں۔ امید کب ٹوٹتی ہے۔ امید تو سانس کی ڈور ہے آدمی ٹوٹ گرتا ہے جب امید ٹوٹتی ہے ہر چند کہ توقع نہیں ہوتی پھر بھی اپنے اندر زندہ رہتے ہیں۔"(۲۱)

امید ہی کی وجہ سے مشرقی وجودیت اور مغربی وجودیت میں فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔

## جوش عمل

ادیب اپنے معاشرہ ہونے میں والے عوامل کا ترجمان ہے۔ وہ وہی ادب تخلیق کرتا ہے جو اس سماج کی عکاسی کر رہا ہوتا ہے اور معاشرے کے باریک پہلو کو بھی بڑی نزاکت سے قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ احمد جاوید کے افسانوں میں بھی سماجی حقیقت نگاری دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ ان برائیوں کو سامنے لاتے ہیں جو انسانی اقدار کے زوال کا باعث بنی۔ اس حوالے سے وہ یوں رقمطراز ہیں

> "ادب میں وہی باتیں زیر بحث آتی ہیں جو غالب ہوتی ہیں اس طرح ہم ان رویوں اور تخلیقات کو منتخب کرتے ہیں جو ارتقائی حوالوں سے اکثریت کو Represent کریں"(۲۲)

احمد جاوید نے اندروں شہر کے مسائل کو پیشکش کیا ملکی حالات نے زیادہ دیر تک چپ رہنے نہیں دیا۔ احمد جاوید نے ان حالات کے خلاف شدید احتجاج کیا ہے اس کے ساتھ ہی وہ کچھ کر گزرنے کے عمل کو تیز تر کرنے کی بھی ترغیب کرتے دکھائی دیتے ہیں پُر امید رہنے کے ساتھ جدوجہد کرنے کی بھی تلقین کرتے ہیں۔ اپنی

شناخت کا مسئلہ ہو یا اس گھٹن زدہ ماحول سے فرار، اپنے ہر عمل میں جذبے کو فروغ دیا۔ اگرچہ ہر ظلمت کی رات کی سحر ہے لیکن اس کی تلاش میں محو رہنا بھی ضروری ہے۔ افسانہ شیشے کی گلیاں کا کردار آزادی کی خاطر کچھ عملی طور پر کرنے کے لیے اپنے دوستوں کے ساتھ منصوبے بناتا ہے

"شام کے بعد ہمارا معمول تھا کہ ہم بہت سے دوست اکٹھے ہو کر اس بے ہنگم، بے ڈھنگی دنیا کو سنوارنے کے منصوبے بناتے۔ جہاں کھیلتے کھیلتے آدمی ہجوم میں گم ہو جاتا ہے۔ ہم کہتے جب تک یہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں بنتی ہم اسی طرح بھٹکتے رہیں گے۔۔۔۔ سو آؤ کوئی حیلہ کریں۔"(۴۳)

احمد جاوید کے اندر تبدیلی کی خواہش تھی کی افراتفری اور ہجوم زدہ معاشرے کو بدلنا چاہتے تھے لیکن احتجاج کی صورت میں نتیجہ کچھ اور ہوتا تھا اس دور کی پابندیوں پر طنز کرتے ہیں اور ان کے خلاف آواز بلند کرنے کی صورت میں جو نتائج سامنے آتے ہیں ان پر بھی تنقید کرتے ہیں لیکن ان کے کردار محض ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھتے ہیں بلکہ ان کے اندر جوش پیدا کیا ہے کی وہ کچھ کریں۔ مذکورہ افسانے کا کرداران حالات کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور اس کے نتائج بھی بتاتا ہے۔

"ہمارا حیلہ کرنا اور کیا تھا؟ دیواروں پر پوسٹر لگانا، چیخنا، نعرہ زن ہو جانا۔ دن بھر رات بھر۔ حتیٰ کہ صبح ہو جاتی یا شام ہو جاتی۔ پھر الگ الگ سر جھکائے گھروں کو لوٹ آتے۔ یہی تو معمول تھا۔ پھر دور کہیں سیٹیاں بجتیں۔ کوئی تعاقب کرتا۔ ہم بھاگ کھڑے ہوتے حتیٰ کہ صبح ہو جاتی یا شام۔"(۴۴)

گمشدہ شہر کی داستان میں ایک شخص سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی کوشش کرتا ہے جن سے وقت نے ان کا سب کچھ چھین لیا ہے حتیٰ کہ ان کے گھروں کی چھتیں بھی نہیں لیکن اسے پاگل سمجھ کر قید کر لیا گیا۔ اس افسانے میں احمد جاوید نے خواب غفلت میں سوئی ہوئی قوم کو جگانے کی کوشش کی ہے۔

"مگر جب اسے تمام گھروں کی چھتیں غائب دکھائی گیئں تو وہ بہت ہنسا کہ کیوں میں نہ

کہتا تھا کہ تم سوئے ہوئے رہنے والوں کا سبب اجڑ جائے گا بولو میں نے ہی کہا تھا
کہ شہر میں داخل ہونے والو اس اسرار کو سمجھو کہ یہاں راتوں کو سونے والے
خاموش آندھیوں کی نذر ہو جائیں گے۔"(۲۵)

وہ لوگوں کو مخاطب کرتا ہے؛

"لوگو! آسمان کی طرف دیکھو کہ بادل برسنے پڑنے کو تلے ہیں۔ سنو تمہارے مکان
تالاب کی طرح پانیوں سے بھر جائیں گے اور تمہارے لاشے گلیوں اور سڑکوں پر تیرتے
پھریں گے۔ لوگو نہ سمجھو گے تو گدھیں اور چیلیں تمہارے جسموں کی بوٹی بوٹی نوچ
کھائیں گی تب کون پرسان حال ہو گا؟"(۲۶)

اس کے باوجود شہر کے لوگ پھر خواب دیکھنے میں محو ہو جاتے ہیں آنکھ کھلنے پر سارا شہر گم ہو جاتا ہے ہے تب اس آزاد شخص سے شہر کی یہ صورتحال نہ دیکھی گئی اور اس نے اپنے گریبان کو چاک کر دیا۔ بیمار کی رات میں ایک شخص جو ایسے گھر میں داخل ہو جاتا ہے جو ویران ہے لیکن اس کے خیال میں اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا کہ ویران گھر ہے اور زنگ آلود تالا۔ اس میں تنہائی کے سوا کچھ نہیں ہو گا لیکن جب وحشت اور گھٹن کے عمل نے اسے جذباتی کر دیا اس نے جوش میں آکر کر اپنے اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔

"تو اس نے گھبرا کر نعرہ مستانہ بلند کیا اور گریبان چاک کر لیا۔ دامن تار تار ہوا
تو حیرت ہوئی کہ دروازے کے پٹ وا تھے۔ بھید افشاء تھا۔ تو اس نے گریبان
چاک کرنے اور اس میں داخل ہونے سے پہلے جو سوچا تھا وہ گماں تھا۔"(۲۷)

اس افسانے میں احمد جاوید نے کسی بھی کام کے لیے جوش وجذبے کو ضروری قرار دیا ہے جب انسان کے اندر کچھ کرنے کا جذبہ نہ ہو وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح آزادی حاصل کرتے کے لیے جوش عمل ہونا ضروری ہے۔ احمد جاوید کے مطابق رکے ہوئے حالات ہوں یا موسم، ان میں اچانک بدلاؤ آتا ہے، لیکن اس کے پس پردہ ایک طوفان ہوتا ہے جو یکدم اس میں تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ افسانہ آثار میں وہ تبدیلی کی نوید سناتے ہیں

"جب کوئی پرندہ بولے اور مسلسل بولتا جائے۔ جب ڈربوں میں مرغیاں بدحواس ہو کر اچھل کود کرنے لگیں۔ جب جانور اپنے طویلوں میں بے چین ہو جائیں رسہ تڑانے لگیں کچھ ہونے والا ہوتا ہے۔"(۲۸)

اسی افسانے میں لکھتے ہیں "موسم اسی طرح بدلتے ہیں گرمیوں میں برسات اسی طرح ہوتی ہے اچانک بادل دوڑتے ہیں، پھیل جاتے ہیں برس پڑتے ہیں۔"(۲۹) احمد جاوید نے اپنے کرداروں کو آزادی اور ظلم کے خلاف بغاوت کے لیے تیار کیا اور ان کے اندر آزاد رہنے کا جذبہ پیدا کیا

## ب۔ احمد جاوید کے افسانوں میں قنوطی وجودی عناصر

احمد جاوید علامتی انداز میں قنوطی وجودی عناصر کو بیان کیا ہے۔ اس وقت علامت کا رجحان تھا اور دوسری طرف آزادی رائے پر پابندی تھی۔ ملک سیاسی کشمکش کا شکار تھا جن حالات کا سامنا قوم نے کیا ان کو احمد جاوید نے علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ ملک کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا، آزادی اظہار رائے پر پابندی اور اس کے باعث ملک میں پھیلی گھٹن کا ذکر جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ پولیس، بم دھماکے، اعلیٰ حکام کا نچلے طبقے پر ظلم و ستم، ہجوم، ان تمام مسائل کو بزبان قلم بیان کیا ہے۔ احمد جاوید لکھتے ہیں "گمشدہ شہر کی داستان، پاکستان کے دولخت ہونے کے بعد شاید اس کے اثر میں لکھی تھی۔" (۳۰) ان کی بیشتر کہانیوں میں پرندے، کیڑے مکوڑے اور جانوروں کی علامتیں ملتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اردو ادب میں اہم رجحان وجودیت کا تھا۔ احمد جاوید نے اس سے بھی اثر قبول کیا۔ ذیل میں چند منتخب افسانوں کا وجودیت کے تناظر میں جائزہ کیا گیا ہے۔

### گھٹن

گھٹن دم گھٹنے اور سانس رکنے کا نام ہے حبس کی وہ کیفیت جو ہوا کے بند ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ احمد جاوید کے افسانوں میں کثرت سے اس کا ذکر ملتا ہے۔ دراصل اس سے مراد جذبات کی وہ گھٹن ہے جو خاموش رہنے کے باعث وجود میں آتی ہے۔ مارشل لاء کے باعث عوام سے حق آزادی رائے چھین لیا گیا کوئی شخص سرعام اس ظلم کے خلاف آواز نہیں بلند کر سکتا تھا۔ عوام سے آزادی کے حقوق چھن لیے گئے بغاوت کرنے والوں کو طرح طرح کی سزائیں دی جانے لگیں۔ ملک تاریخ کے سیاہ ترین دور سے گزر رہا تھا ہر طرف گہما گہمی کا عالم تھا۔ اگرچہ لوگ اندر ہی اندر کڑھتے تھے لیکن اظہار نہیں کر سکتے تھے اظہار کرنا جان سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔ ان حالات میں علامتوں اور استعاروں کے ذریعے ادیبوں نے احتجاج کیا۔ احمد جاوید

نے بھی علامتوں کر ذریعے اس سیاسی بحران کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کے بیشتر افسانوں میں گرمی کا موسم اور حبس کا ذکر ملتا ہے اور اس کی وجہ سے گھٹن پھیلی ہے۔ در حقیقت طویل مدتی مارشل لاء اور ملکی نظام ساکت رہنے کی وجہ سے پورا ملک گھٹن کا شکار تھا۔ بقول احمد جاوید

"۱۹۷۷ء میں جب ایک بار پھر مارشل لاء نافذ ہوا تو شعر وادب کو ایسا زرخیز موضوع ہاتھ آگیا جو علامتوں سے بھرا تھا۔ اس زمانے میں ۱۹۸۳ء تک میں نے جو کہانیاں لکھیں ان میں بیشتر میرے پہلے مجموعے "غیر علامتی کہانی" میں شامل ہیں۔ بعض کہانیوں میں حبس اور اس موسم کے متعلقات کا جابجا ذکر ہے۔"(۳۱)

افسانہ غیر علامتی کہانی میں احمد جاوید ماحول سے تنگ ہیں "اور میں ان سب کی طرف دیکھتا ہوں مگر کوئی منظر ایسا ہو جو ذرا الگ ہو، مختلف ہو۔ کہ یہ برسوں سے جامد وساکن دنیا میرے لیے تحریک کا باعث نہیں"(۳۲)

احمد جاوید نے معاشرے میں پھیلی لوٹ کھسوٹ، رشوت، فریب اور دھوکہ دہی کو موضوع بنایا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ وحشت کا شکار ہوا۔ افسانہ جنگل، جانور، آدمی کا مرکزی کردار انسان نما بھیڑیوں کے ہجوم میں گھٹن محسوس کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں پہچان پاتا ہے کہ یہ انسان ہیں یا کسی جنگل میں جانور یا درخت۔ مذکورہ افسانے کا کردار کہتا ہے

"اتنے آدمی کہاں سے آگئے تھے یا میں اتنے آدمیوں میں کہاں سے آگیا تھا۔ دم گھٹنے لگا تھا سانس رکنے لگی تھی۔ مگر چلنا پڑتا تھا بس چلتے رہے۔ نہیں چلوگے تو ہجوم گراتے ہوئے، کچلتے ہوئے، روندتے ہوئے گزر جائے گا۔ بس ایسا ہی عالم تھا۔"(۳۳)

آسیب زدہ رات، میں اس زمانے کا رونا روتے ہیں جو نہ کٹتا ہے نہ ختم ہوتا ہے۔ ہر طرف ایسا ماحول ہے کہ ڈر اور خوف نے گھیرا ہے۔ پولیس کے چھاپے، اچانک شہر اور گلیاں کا سنسان ہو جانا اور ہر وقت کچھ ہونے کے خوف نے انسان کو گھٹن کا شکار کر دیا تھا۔ مذکورہ افسانے کا کردار جو اس آسیب زدہ رات کا شکار ہوا وہ اس گھٹن کو یوں بیان کرتا ہے

"دیواروں اور دروازوں پر جتنے موسم رقم تھے وہ مجھ پر بھی بیتتے تھے۔ نسل در نسل ہم

نے ان کو جھیلا ہے۔ اری کائی جو ادھر اُدھر دیواروں پر جمی تھی ساتھ ساتھ ہماری
روحوں میں اتری تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہمارا حال ایک سا تھا۔ ایک بار تو جی چاہا کہ
دیوار سے لپٹ کر رو لیا جائے مگر ہمسائے کا خیال تھا میں رنجیدہ سا آکر کمرے میں بیٹھ گیا۔"(۳۴)

افسانہ آثار بھی ایسی ہی کہانی ہے جس میں احمد جاوید نے وقت کے نہ بیتنے کا شکوہ کیا ہے جو دم گھٹنے کا باعث بنا ہے۔ "دن پر دن بیتتے جاتے ہیں۔ جیسے صدیاں گزر گئی ہوں حبس کا یہ موسم گزرتا ہی نہیں۔ نہ ہوا چلتی ہے نہ بارش برستی ہے۔" (۳۵) دراصل اس سیاسی ماحول پر طنز ہے جو کئی سالوں تک ایک جیسا چلتا رہا۔ ہر صبح لوگ اس امید کے ساتھ اٹھتے کہ کیوں کہ ہر اندھیری رات کے گھنے بادلوں نے چھٹ جانا ہوتا ہے۔ لوگ ہر روز اخبار پڑھتے کہ شاید آج کوئی اچھی خبر ہو۔ مذکورہ بالا افسانے کردار کہتا ہے؛ " بس اسی خیال میں رہتا ہاں اور موسم کی خبریں پڑھتا ہوں اس سے زیادہ مجھے اخبار سے اور کچھ کام نہیں ہوتا۔"(۳۶) اس گھٹن میں مزید اضافہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی کی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔ چوری، خوشامد، خود غرضی اور لاپرواہی نے ایسا ماحول بنا دیا تھا کہ آدمی صرف شکل سے ہی آدمی نظر آتے تھے ان کے فعل جانوروں سے بھی بدترین تھے گشت پر نکلا ہوا سپاہی، ایسی ہی ایک کہانی ہے

" آدمی کہاں ہیں شاید ان کے پیچھے چھپ گئے یہاں سے صاف دکھائی نہیں دیتے،
کتا نظر آتا ہے، کوے نظر آتے ہیں، آدمی نظر نہیں آتے ہیں۔" (۳۷)

یہی وہ عناصر تھے جو معاشرے میں بگاڑ کا باعث بنے۔ اس دور میں اگر اس ماحول کے خلاف آواز بلند کی جاتی تو اس کا انجام صرف موت تھا۔ ایسے معاشرے میں انسان کے لئے زندہ رہنا مشکل تھا۔ جہاں اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو۔ افسانہ باہر والی آنکھ، میں احمد جاوید نے رمزیہ انداز میں اس ماحول پر تنقید کی ہے

"فرش پر پتنگوں کے جلے ہوئے پر پڑے ہیں اور پتنگے بھی۔ پتنگے حبس کے
دنوں میں ہوتے ہیں یا کہیں سے آجاتے ہیں یا کہیں چھپے ہوتے ہیں اور گھٹن
سے وحشت زدہ ہو کر باہر نکل آتے ہیں تو یہ حبس کے دن ہوں گے۔"(۳۸)

احمد جاوید کے افسانوں میں حبس اور گرمی کی شدت علامتی انداز میں مارشل لاء کے خلاف احتجاج ہے وہ پابندیوں کے باعث گھٹن محسوس کرتے ہیں وہ اس ملک کی آزاد فضاؤں میں سانس لینا چاہتے ہیں۔

## خوف

۷۰ء کی دہائی میں انسانی اقدار کھو دینا، خود غرضی کا بڑھنا، لالچ اور حرص کا دور دورہ ہونا، لوٹ مار ایسے تمام عوامل نے خوف اور وحشت کو جنم دیا انسان، انسان کا دشمن ہو گیا۔ صنعتی ترقی تو ہوئی لیکن اپنائیت ختم ہو گئی۔ رشتوں کی پہچان نہ رہی۔ یوں تو پاکستان میں پہلے بھی مارشل لاء نافذ کیے گئے لیکن ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے خلاف شدید ردعمل دیکھنے کو ملتا ہے علامتوں اور استعاروں کے سہارے ادب میں فنکاروں نے اپنی بات عوام تک پہچانے اور سیاسی بحران کے خلاف آواز بلند کی۔ اس دور میں جو ظلم و ستم کیا گیا احمد جاوید نے اپنے کرداروں کے ذریعے پیش کیا رمزیہ پیرائے میں عوام کے خوف کو بیان کیا۔

افسانہ بھیڑیے میں طاقتور طبقے کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ وہ بظاہر تو آدمی ہیں لیکن بھیڑوں کی طرح کے خطرناک وحشی درندے ہیں جو کمزور طبقے کو گھات لگا کر اپنا نشانہ بناتے ہیں۔ بھیڑے کو علامتی انداز میں اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ یہ وحشی درندہ ہے جس سے کمزور جانور ہمیشہ خوفزدہ رہتے ہیں۔ افسانے کا کردار یہ کہتا ہے کہ بھیڑے انسانی عقل اور انسانی شکل کے مالک بن گئے ہیں۔ بھیڑوں جیسی وحشی صفات کے مالک طبقے پر طنز ہے۔ ” بھیڑے کی غراہٹ ہمیشہ سے طبل جنگ ہے ہر اس کے خلاف جو ان کے آگے بدحواسی میں بھاگنے اور بھاگتے گر پڑنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔“(۳۹) بھیڑے یوں تو دوسرے جانوروں کے لیے خوف کا باعث ہیں لیکن اس بار کچھ ایسی تبدیلی ہوئی کہ ان کو خود فکر لاحق ہوگئی وہ آدمیوں جیسی عقل رکھنے پر اور سوچنے سمجھنے اور بولنے کی طاقت دیکھ کر حیران ہیں۔ اگرچہ وہ بھیڑوں کی جون میں ہیں، باقی صلاحیتیں آدمیوں والی آگئی ہیں۔ انسان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی اسے دوسری مخلوق سے ممتاز کرتی ہے لیکن انسان نے اس کا استعمال اپنے ذاتی مفاد کے لیے کیا تو دوسرے انسان اس سے محفوظ نہ رہ سکے، اس نے اپنے ہی ہم جنسوں کا استحصال کر کے اپنی زندگی کو بہتر بنایا۔ اس طرح انسان کو دوسرے انسان سے خوف محسوس ہونے لگا۔ احمد جاوید طاقت پر طنز کرتے ہیں

> ”عقل رکھنے والے جلدی فکر مند ہوتے ہیں۔ اگر طاقت بھی ہمراہ رکھتے ہوں تو طاقت کے کم ہو جانے کا اندیشہ وحشت میں بھی مبتلا کر دیتا ہے۔ رنجیدہ بھی کر دیتا ہے۔“(۴۰)

انسان کی سوچ اسے فکر میں مبتلا کر دیتی ہے وہ وحشت کا شکار اس وقت ہوتا ہے جب وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ صحیح اور غلط میں فرق نہیں کر پاتا۔ انسان کی ذمہ داریاں اسے وحشت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ آسیب زدہ

رات اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ افسانے کا کردار اپنی فکر سے وحشت زدہ ہے وہ ہر وقت خوف زدہ رہتا ہے پورے افسانے میں خوف طاری رہتا ہے

> "فکر ہمیشہ سے میرے سامنے رہتی ہے میرے دیکھتے ہی دیکھتے کتنوں کی عمر اس گھر میں خواب دیکھتے بسر ہوئی، مگر سب کچھ ویسا ہی رہا یہاں طویل رات طویل ہوتی رہی دن کڑے ہوتے رہے۔"(۴۱)

> "ہزار رستے تھے ان دنوں بھی جب میں چھوٹا ہوتا تھا مگر تب میں دوسروں کی امان میں تھا اب دوسروں کی حفاظت کا بہت بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ سب سوئے تھے، میں جاگتا تھا، خوف تھا، وسوسہ تھا۔ اندیشے تھے طویل رات کٹتی نہ تھی۔"(۴۲)

مذکورہ افسانے کے مرکزی کردار کو ہر وقت یہ خوف رہتا تھا کہ یہ چھت گر جائے گی اور ہم اس کے ملبے میں دب جائیں گے۔ اس خوف نے اس سے سے رات کی نیند بھی چھین لی۔ وہ اپنے گھر سے بھاگنا چاہتا تھا لیکن کہیں کوئی تحفظ فراہم نہیں تھا۔

> "کہیں کوئی جائے امان نہیں ہے جب سے ہوش سنبھالا ہے نہ گھر کے اندر نہ گھر کے باہر، ہر جگہ کوئی انجانا ان دیکھا خوف تعاقب میں رہتا ہے"(۴۳)

احمد جاوید نے اظہار پر پابندی کے باعث تنقید کرتے ہوئے ڈر کر رہنے اور حکم کا پابند رہنے میں ہی عافیت بتائی ہے۔ اور اس کے باعث ملک میں جو خوف وہراس کی فضا بھی تھی اس پر تنقید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ احمد جاوید لکھتے ہیں۔

> "کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے ہاتھ کھڑے کر دیے جائیں بولنا نہیں چاہیے۔ سر جھکا دینا چاہیے حکم کا پابند ہونا چاہیے کہ خوف کے موسموں میں آدمی کے اطمینان کی بس ایک راہ ہوتی ہے۔"(۴۴)

انسان کے اندر جب ڈر اور خوف کو جگہ بنالے تو وہ وہیں کا ہو کے رہ جاتا ہے چاہے بچپن میں پالا گیا ڈر ہی کیوں نہ ہو انسانی دماغ سے ڈر نہیں جاتا

”ڈر کہاں جاتا ہے ڈر تو اندھیرے میں آدمی کی پرچھائی ہے بس بیٹھا رہتا ہے اندر ہی اندر
جب دل کی دھڑکن ڈوبنے لگتی ہے جب کشتی ڈوبنے لگتی ہے جب ٹوٹے کباڑ بولتے
ہیں جلسہ گاہوں میں اور جلوسوں میں جب بھگدڑ مچتی ہے ڈر بولتا ہے اور خالی مکانوں
اور بے آسرا لوگوں پر حکومت کرتا ہے ڈر کا قانون چلتا ہے۔“(۴۵)

احمد جاوید نے اس دور کے ایک عام آدمی کے اندر جنم لینے والے خوف اور وحشت کو بیان کیا ہے، گشت پر نکلے ہوئے سپاہی کا ڈر، آزادی رائے پر سزا کا ڈر ہو، اس خوف کو انہوں نے افسانوں کے ذریعے بیان کیا۔ انسان کے اندر رکے ہوئے طویل مدتی سیاسی حالات اور معاشرے کے لوگوں کے رویوں سے پیدا ہونے والی وحشت اکثر کرداروں میں نظر آتی ہے۔ وہ اس تنزلی کے شکار معاشرے سے روپوش ہونا چاہتے ہیں لیکن فکر اور ذمہ داریاں ان کو ایسا کرنے سے روکے رکھتی ہیں۔

## کرب

کرب دکھ کی وہ کیفیت ہے جو انسان کو اس کی روح تک اذیت پہنچاتی ہے۔ دکھ تکلیف جسمانی حد تک بھی برے ہیں لیکن دکھ کی انتہائی کیفیت تب ہوتی ہے جب انسان کی روح بھی کسی تکلیف کا سامنا کر رہی ہو۔ کرب کی کیفیت میں انسان کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا وہ کشمکش کی حالت میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے۔ وجودیوں کے نزدیک کرب وہ ہے جب انسان کسی دوراہے پر کھڑا ہو اور اس کا عمل دوسروں کے لئے بھی سود مند لیکن وہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ میرے لیے بہتر کیا ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں جب وجودیت نے اردو ادب میں قدم رکھا تو اس وقت ملک پاکستان کی حالت کچھ ایسی تھی کہ انسان عدم تحفظ کا شکار تھا۔ ایسے حالات میں جو ادب تخلیق کیا گیا اس میں شعوری یا لاشعوری سطح پر وجودیت کے عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کرب وجودیت کا اہم عنصر ہے۔ احمد جاوید کے افسانوں میں بھی کرب دیکھنے کو ملتا ہے۔ اکثر کردار اپنی زندگی سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہر طرف خوف وہراس کی فضا ہے تمام حالات میں انسان کے پاس کوئی جائے امان نہیں ہے اور نہ ہی کوئی فیصلہ کرتا ہے کہ کیا جائے جو کہ ان حالات سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے۔ اعلی حکام کا نچلے طبقے پر ظلم و ستم انسان کو روح تک چھلنی کر دیتا ہے۔ انسان کو اپنا وجود بھی بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ خود کو قیدی سمجھنے لگتا ہے اور اس سے چھٹکارے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

افسانہ کبوتر ایسی ہی کہانی ہے جو کہ قید سے آزاد ہونا چاہتا ہے۔ احمد جاوید نے علامتی انداز میں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان جو کہ آزاد پیدا ہوا ہے لیکن وہ حکام کی سختیوں اور قید و بند نے اسے ایک قیدی بنا دیا۔ وہ خود سے کوئی فیصلہ بھی کرنے کے قابل نہ رہا زندگی میں ایسے دن بھی تھے جب ہر انسان آزادانہ زندگی گزار رہا تھا۔ کسی کو کوئی خوف و خطرہ نہیں تھا لیکن تقسیم کے وقت سے لے کر ملک کے حالات اس قدر تنزلی کا شکار ہوئے کہ انسان خود کو ایک کٹھ پتلی تصور کرنے لگا۔ وہ ایک ایسے قیدی پرندے کی طرح بن گیا جو شروع میں اس قید سے آزاد ہونے کے لیے بہت پھڑ پھڑاتا ہے، دانہ پانی تک چھوڑ دیتا ہے لیکن کوئی کوشش اس کی اثر نہیں لاتی۔ حتیٰ کہ اسے اب اس قید کی عادت سی ہو جاتی ہے اسی طرح کا سلوک انسانوں کے ساتھ بھی کیا گیا جو اب ان سختیوں کو جھیلنے کے عادی ہو گئے لیکن جس کرب اور اذیت سے وہ گزرے وہ ان تک ہی محدود رہی۔ اس افسانے میں کبوتر کو جب شروع میں قید کیا گیا تو اس نے بہت کوشش کی کہ وہ اس قید سے آزادی حاصل کرے لیکن تھک ہار کر ہوا اپنے ماضی کو یاد کرتا ہے۔ ''کہاں رہ گئی تھی وہ پرواز جو کبھی اختیار نہیں آتی تھی۔''(۴۶)۔ وہ پنجرے میں قید ماضی کی آزادی کو یاد کرتا ہے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ قید کے خلاف جدوجہد نہ کرے۔

> ''کسی جکڑنے والے پنجرے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ تو پرندے کے وجود میں لرزش ہوتی تھی اور کسی نجس گھڑی کے انتظار میں موسم گزر جاتے تھے لیکن کوئی ہمیشہ ایسے کیوں کر گزارے وہ آدمی ہو یا پرندہ ڈھنگ بدلنا پڑتے ہیں۔''(۴۷)

احمد جاوید کے مطابق سب پرندے قید ہیں کوئی آزاد نہیں یہ دنیا ایک قید خانہ ہے جو اس میں آگیا اسے اپنے وجود کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے اور وہ ہر طرح کی زندگی گزارنے کے لئے مجبور ہوتا ہے

> ''وہ پرندے جو مزاروں پر بسیرا کرتے ہیں، گنبد و مینار پر اترتے ہیں اور وہ پرندے مجھے جو شاخ شاخ جھولتے ہیں اور ندی نالوں پر چہکتے ہیں جزیروں کی خبر لانے والے سمندری پرندے اور پرندوں پر جھپٹنے والے پرندے۔ سب پابند ہیں کوئی آزاد نہیں ۔ آسمان اور زمین کے درمیان ایک پنجرے میں پھڑ پھڑاتے ہیں۔ یہ تو یونہی گمان ہوتا ہے کہ وہ اڑتے پھرتے ہیں، شاخ شاخ جھولتے ہیں ملتے ہیں اور آزادی کے گیت گاتے ہیں۔''(۴۸)

قیدی پرندے کو جب آزادی ملتی ہے تو اڑنا ہی بھول جاتا ہے کیونکہ وہ مدتوں کے بعد آزادی ملنے پر وہ یہ بھول گیا کہ اڑان کیسے بھرنی ہے۔ احمد جاوید نے اس ماحول پر کڑی تنقید کی ہے جس نے انسان کو گھروں کے اندر محبوس کر کے رکھ دیا تھا۔ اب اگر انسان کو آزادی بھی ملتی ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا تھا کہ آزاد دنیا میں وہ کیسے زندہ رہے۔ مذکورہ افسانے میں کا کردار کہتا ہے

"منظر جب حافظے سے اترتے ہیں تو شریانوں میں سرکتے ہیں خون کی گردش کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مگر یاد نہیں آتے، آدمی اور پرندے اس حساب سے یکساں ہیں بس کوئی اپنا ہونا جلد فراموش کرتا ہے۔ کوئی رفتہ رفتہ۔ بھولی ہوئی دنیا کے نشان البتہ وجود پر کہیں رہ جاتے ہیں۔"(۴۹)

آزادی کے بارے میں لکھتے ہیں "یہ مکتب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آسمان اور پرندے اور زمین پر آدمی سب آزادی کے استعارہ ہیں مگر کیا آدمی بھی پنجرے میں بند کیا جا سکتا ہے"(۵۰) اسی افسانے میں آگے وہ اذیت ناک اور کربناک صورتحال کا سامنا کرتے ہیں کہ جہاں انسان بھی پابند سلاسل ہیں اور ان کی حفاظت خونخوار درندے کر رہے ہیں۔ انسان اس وقت اذیت ناک صورتحال کا سامنا کرتا ہے جب اسے کسی ایک راستے کا انتخاب کرنا ہو۔ اس افسانے میں کبوتر کو علامتی طور پر لیا گیا ہے اور پرندوں اور آدمیوں کی قید کا ایک جیسا معاملہ بتایا گیا ہے کبوتر کو جب آزاد کیا گیا تو آزاد کیا گیا تو وہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔

"بھلا اور وہ کیا کرتا ہر چند وہ چاہتا تو اڑ سکتا تھا اور حالانکہ بلی نہیں اڑ سکتی تھی۔ مگر وہ فیصلہ نہیں کر پا سکا تھا کہ پر اڑنے کے لیے ہوتے ہیں یا محض پھڑ پھڑانے کے لیے وہ آدمی ہوں یا پرندے جب اڑنے کی عادت بھول جائیں تو آخر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اپنا پنجرہ آپ ہو جاتے ہیں"(۵۱)

افسانہ بھیڑیا بھی وجودی کرب کی مثال ہے۔ جس میں بھیڑیوں نے اپنی جون تبدیل تو نہیں کی لیکن انہیں عقل اور سوچ عطا کی گئی۔ بھیڑیا اس بات پر پریشان ہے کہ کہیں وہ آدمی تو نہیں بن گئے انسان اس قدر گر چکا تھا کہ بھیڑیے بھی اس بات پر حیران ہے کہ کہیں وہ آدمی تو نہیں بن گیا۔ احمد جاوید نے آدمیوں کے رویوں

پر شدید تنقید کی ہے جو کہ عقل رکھنے کے باوجود اپنی طاقت کا استعمال زیادہ کرتے تھے اور کمزور طبقے کا استحصال کرتے ہیں

## لایعنیت

وجودی مفکرین نے اس دنیا کو مہمل قرار دیا ہے اس میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ہمارے لئے کوئی راہ متعین کریں۔ کوئی ایسا اصول متعین کردہ نہیں ہے کہ جس کے مطابق ہم اپنی زندگی گزار سکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کو جیسا رنگ آدمی دینا چاہے یہ وہ اختیار کرلیتی ہے۔ کوئی اخلاقی اقدار مقرر نہیں ہیں۔ ان کا دوسرا موقف یہ بھی ہے کہ ہم اپنی مرضی سے اس دنیا میں نہیں آئے بلکہ ہمیں اس میں پھینکا گیا ہے اب چاہے جیسے ہم زندگی بسر کریں لایعنیت نے اس وقت عروج پکڑا جب انسان نے رشتوں کی قدر کرنا چھوڑ دیں۔ خود غرضی عام ہو گئی لالچ اور حرص پروان چڑھا انسان، انسان کی پہچان بھول گیا اور دنیا مفاد پرست ہو گی۔
احمد جاوید کی افسانوں میں اکثر زندگی بے معنی سی لگتی ہے وہ اس کے لئے لیے کوئی کشش نہیں رکھتے۔ اس کی بڑی وجہ سے وہ ہنگامی صورتحال تھی جس کے باعث پورا ملک انتشار کا شکار تھا۔ شہریوں سے جب ان کے حقوق چھین لیے گئے، ان کو سخت سزائیں تجویز کی جانے لگی انسانیت نچلے درجے تک گر گئی تو انسان کو اس دنیا میں کوئی ایسی وجہ نظر نہ آئی جو زندگی گزارنے کا سبب بن سکتی۔ انسانوں پر انسان ہی درندے بن کر مسلط ہو گئے جھوٹ، مکر و فریب اور خوشامد کے چرچے عام ہو گئے۔ افسانہ کوا میں احمد جاوید بیگانگی کے بارے میں لکھتے ہیں

> ” اپنے پرائے کی پہچان بھولنے کی بات ہمارے گھر میں اکثر ہوتی رہتی تھی جس سے تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔ اس کے بارے میں افسوس سے کہا جاتا ہے کہ فلاں اپنے پرائے کی پہچان بھول گیا ہے۔ مگر اس کے معنی کبھی سمجھ میں نہ آئے تھے۔ “(۵۲)

چڑیا گھر میں احمد جاوید نے زندگی کی مہملیت کو بیان کیا ہے کہ دنیا ایسی جگہ ہے۔ جہاں اسے سنورنے کے سوا اور کوئی کام کرنے یا سوچنے کی فرصت نہیں ملتی ہے۔ زندگی ایک جیسی نہیں رہتی ہے نہ انسان کے مشغلے ایک جیسے رہتے ہیں۔ آدمی بدل جاتا ہے لیکن اسے خبر تک نہیں ہوتی۔ چڑیا گھر کا کردار اپنی بے معنی زندگی کو یوں

بیان کرتا ہے۔ مذکورہ افسانے کا کردار زندگی کو بے معنی سمجھتا ہے سوائے اس کے کہ جب تک اس دنیا میں انسان سانس لے رہا ہے وہ اپنا نصیب سنوارتا رہے اس سے زیادہ اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔

"باقی دن تو ایسے تھے کہ زمین اور آسمان کے بیچ خود اپنی موجودگی کی خبر بھی نہیں ملتی تھی دنیا کا مقدر سنوارنے رہو یا پھر اپنا۔ کچھ ایسا کرتے رہو کہ زندہ رہ سکو۔ زندہ رہنے کے لیے پھولوں اور تتلیوں اور پرندوں کا قرب وجوار ہونا لازم نہیں تو پرندوں کا قرب وجوار میں وجود نہیں رہا تھا۔ بس آدمی تھے اور آدمیوں کا جنگل تھا اور اس جنگل میں رہنے کے لئے راستہ بنانا تھا۔"(۵۳)

موت کا آوارہ کتا، ایسے فقیر کی کہانی ہے جو اس دنیا کو دکھوں کی آماجگاہ سمجھتا ہے اور ان سے نجات کی دعا کرتا رہتا ہے۔ اس کے نزدیک دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ وہ گلی گلی اور گھر گھر دستک دے کر دنیا کو دکھوں سے خالی کرنا چاہتا ہے۔ یہی اس کا معمول تھا شروع میں ہر کسی کی صدا پر وہ دوڑ کر جاتا تھا اور اسے دکھ سے نکالنے کی کوشش کرتا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ ویسا نہ رہا۔

"اب تو چلنا دشوار ہو رہا تھا مگر چلنا پڑتا تھا۔ یہ بھی نہ کرتا تو پھر کیا کرتا کہ دنیا ابھی تک بڑی مشکلوں میں تھی اب بھی جو دروازہ کھلتا تھا دعاؤں کا طالب تھا۔ دکھ ختم کب ہوتے ہیں بس آدمی بدل جاتے ہیں۔"(۵۴)

دنیا دکھوں کا گھر ہے دکھ ایک دل سے دوسرے دل میں منتقل ہو جاتے ہیں لیکن دنیا کو دکھوں سے مکمل خالی کرنا بہت مشکل ہے فقیر گھروں میں آباد بلوگوں کو دکھ سمجھتا ہے

" وہ سمجھتا تھا جو نئے مکان ہیں ان میں نئے دکھ آباد ہیں ہیں جو پرانے ہیں ان میں کہنہ سال غموں کا قیام ہے یہ دنیا اس کے لیے ایسی ہی جگہ تھی"(۵۵)

فقیر اس دنیا کو غموں کی آماجگاہ خیال کرتا ہے کہ اس دنیا میں رہنے والے لوگ سارے دکھ ہیں اور انسان صرف دکھوں اور غموں کو سہنے کی خاطر اس دنیا میں آیا ہے وہ ہر وقت شہر کے لیے دعا کرتا تھا غم زدہ لوگوں کے لئے نجات کی دعا کرتا۔ اس کے لیے یہ دنیا یہ مہمل تھی۔ کوئی شخص اس میں دکھوں سے خالی نہ تھا۔ اس نے اس دنیا میں مسکراتے لوگوں کو روتے دیکھا اور روتے روتے لوگوں کو مسکراتے دیکھا۔ اسے اس دنیا سے

اعتبار اٹھ چکا تھا آخر تھک ہار کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے جب ایک گھر میں بچے کی پیدائش ہوتی ہے ”ایک دکھ ختم ہوتا ہے ایک پیدا ہوتا ہے یہ دنیا تیری دعاؤں کے اختیار سے باہر ہے۔“ (۵۶) دنیا کے لایعنی ہونے کا اندازہ تب ہوا جب ان لوگوں کو گھروں میں محصور کر دیا گیا اور وہ صرف خواہشوں اور خوابوں کی دنیا میں رہنے لگے۔ عملی طور پر دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہ رہا کہانی کی گرہ، میں احمد جاوید نے زندگی کی لایعنیت کو اس طرح بیان کیا ہے۔ اس افسانے میں شام کا ذکر یوں کرتے ہیں

”پھر رات ڈھلتی اور چارپائیاں صحن میں بچھ جاتی۔ بتی گل کر دی جاتی اور ہم اپنی مکانوں کی تنگ چار دیواروں میں محبوس ہو جاتے۔ ہمارا رابطہ دنیا سے منقطع ہو جاتا“ (۵۷)

اس دنیا میں صرف خوابوں اور خواہشوں کا ریلا تھا اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ ”خواہشیں تو لوگوں کا، بسوں کا، موٹروں کا اژدھام ہے ایک دوسرے سے سے دھکم پیل کرتا، آگے بڑھتا، ٹکراتا، پاش پاش ہوتا ہوا“ (۵۸) انسان اپنی مادی ضروریات پوری کرنے کی خاطر دن رات کاموں میں مشغول رہتا رشتوں کی اہمیت کھو گئی وہ صرف اپنی خواہشات کی تکمیل میں مگن ہو گیا زندگی خواہشات تک محدود ہو کر رہ گئی آدمی کا عملی طور پر اس دنیا سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

”میں ان دنوں سے خواب دیکھتا ہوں جب وہ دونوں چین کی نیند سو جاتے تو میں جاگتا رہتا تب ہمارے گھر کی تنگ و تاریک چار دیواری اور تنگ ہو جاتی ہے۔ لگتا جیسے ہمیں کسی نے اندھے کنویں میں دھکیل دیا ہو بس باہر کی دنیا سے اگر رشتہ ہوتا تو اتنا کہ آسمان پر چمکنے والے ستارے نظر آتے۔ یوں جیسے کنوئیں میں جھانک کر اپنی صورت دیکھتے ہوں“ (۵۹)

افسانہ شام اور پرندے، میں بھی زندگی کی مہملیت نظر آتی ہے۔ احمد جاوید لکھتے ہیں اپنے آبائی گھروں کو لوٹا جا سکتا ہے لیکن زندگی کو دوبارہ سے نہیں شروع کیا جا سکتا۔ اس کا آغاز مشکل ہے گزرا ہوا وقت واپس نہیں آسکتا۔ گزرے ہوئے وقت کو صرف یادوں کے سہارے ہی گزارا جا سکتا ہے پرانی چیزوں کو اہمیت نہیں ہوتی ان کو صرف الماریوں، صندوق میں رکھ دیا جاتا ہے اور پرانے چہرے ویسے نہیں رہتے اور نہ انکے نام یاد رہتے

ہیں۔" آدمی ویسے کب رہتا ہے۔ بال چاندی ہو جاتے ہیں۔ کمر جھک آتی ہے ہم کیسے تھے۔ الماری کی چابی اب نہیں ملتی۔"(۶۰) احمد جاوید آدمی کی قدر و قیمت کھو جانے کے بارے میں لکھتے ہیں

"میں نکل گیا تھا پیچھے تالے کو زنگ لگتا رہا۔ چابی اب نہیں ملتی آخر آدمی کب تک محفوظ رکھے۔ شہر شہر آدمیوں کا شمار نہیں۔ کھوئے سے کھوا چھلتا ہے۔ بھگدڑ مچی ہے چہروں میں چہرے، ناموں میں نام گڈ مڈ ہوتے جاتے ہیں دنیا گرتی پڑتی جاتی ہے۔"(۶۱)

افسانہ سن تو سہی میں انسانی زندگی کی بے بسی کا اظہار کرتے ہیں

"سنو میں سردار ہوں مگر اس میں میری مرضی میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں مجھے جیسا ہونا چاہیے تھا میں ویسا ہوں تمہیں جیسے ہونا چاہیے تھا تم ویسے ہو آخر اس میں جھگڑا کیا ہے۔"(۶۲)

## موت

وجودی مفکر ہائیڈ گر کا ماننا ہے کہ انسان کی زندگی کے بعد موت کا عنصر اس کی زندگی کے مقصد کو فیل کرتا ہے ہر آغاز کا اختتام ہے اسی طرح ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ وجودیوں کے نزدیک یہ تکلیف دہ امر ہے کہ نہ ہم اپنی مرضی سے اس دنیا میں آئے ہیں نہ اپنی مرضی سے اس دنیا سے جان چھڑا سکتے ہیں یعنی ہمارے وجود میں ہماری رائے یا ہماری مرضی کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اسی طرح موت بھی ہماری مانگی ہے نہ ہم اپنی مرضی سے اس دنیا میں آئے ہیں نہ اپنی مرضی سے اس دنیا سے جا سکتے ہیں۔ نہ زندگی ہماری منتخب کردہ ہے اور نہ موت اگر کوئی اپنی زندگی سے اپنی مرضی سے چھٹکارہ حاصل کرتا ہے تو وہ یہ راہ اپنے لیے خود منتخب کرتا ہے۔ اور اس کی سزا بھی خود ہی بھگتے گا۔

احمد جاوید اس راستے کے انتخاب کے قائل نہیں نظر آتے۔ ان کے اکثر افسانے پر امید رہنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن کہیں کہیں موت ہی دکھوں کا مداوا کرتی نظر آتی ہے۔ جیسے موت کا آوارہ کتا یہ، ایسے فقیر کی کہانی ہے جو مسلسل سارے شہر کے گھروں میں جاتا ہے اور تمام لوگوں کو دکھوں سے آزاد کرانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ ایک دن وہ اس دنیا سے آزاد کر دے گا وہ ہر ایک کے لئے نجات کی دعا کرتا ہے کہ نجات ہی انسان کو اس دکھوں کے گھروں سے آزاد کر سکتی ہے۔ وہ دکھوں سے مراد انسان لیتا ہے ۔لفظ نجات کی وضاحت یوں کرتا ہے

"یہ نجات کا لفظ بھی عجیب جادو لے کر اس پر منکشف ہوا تھا کئی دفعہ اس نے اس لفظ نجات سے سارے دکھ سمیٹ لئے، ایڑیاں رگڑتے سسکتے لوگ جب کسی پل چین نہ پایا تو پھر ان کے لیے نجات کی دعا مانگتا جسم تو ٹوٹ گرنے اور پھر گلنے سڑنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں اور کوئی دعا کیا کام آئے گی۔ زندگی میں تو وہ ہنستے مسکراتے لوگوں کے لئے بھی دعا مانگتا ہے کہ اس نے اکثر دیکھا تھا کہ لوگ روتے روتے ہنس پڑے تھے اور ہنستے ہنستے رو پڑتے تھے۔ کچھ اعتبار نہیں تھا کیا اعتبار تھا کہ مردہ زندہ ہو جائے اور تنی ہوئی گردن والے توانا اور شادماں جسم بس دیکھتے ہی دیکھتے شہتیر کی طرح گر پڑیں۔ یہ دنیا ایسی ہی جگہ تھی کچھ اعتبار نہیں تھا"(۶۳)

فقیر کو ہر شخص دکھ لگتا تھا کہ اس دنیا میں پیدا ہونے والے لوگ دکھ ہیں اسے گھروں میں آباد لوگ، لوگ نہیں بلکہ دکھ نظر آتے تھے۔ وہ ہر ایک کے لئے نجات کی دعا کرتا تھا کہ نجات ہی انسان کے غموں کا حل ہے کیوں کہ انسان مرنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ فقیر کہتا ہے "اور سب دکھوں کی ایک ہی دعا ہے نجات" (۶۴) درد سے کرلاتا ہوا کتا جب اسے نظر آتا ہے تو وہ اس کے لئے بھی نجات کی دعا کرتا ہے

"اپاہج کتے کا موت کے سوا اور چارہ کیا ہے۔ فقیر نے خیال کیا۔ مگر اتمام حجت، اک دعا، دعا جو سب کے لئے ہے۔ کوئی جیسا ہے اور جہاں ہے۔"(۶۵)

اس کے ساتھ ہی دردِ زہ میں مبتلا عورت کے لئے بھی یہی دعا کرتا ہے لیکن جب اس کے ہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے تو وہ مایوس ہوتا ہے اور کہتا ہے "ایک دکھ ختم ہوتا ہے تو ایک دکھ پیدا ہوتا ہے یہ دنیا تیری دعاؤں کے اختیار سے باہر ہے" (۶۶) دراصل وہ اس دنیا کو انسانوں اور جانوروں سے خالی دیکھنا چاہتا تھا کہ آخر کار اس دکھ دہ زندگی سے موت بہتر ہے۔ اور پھر خودکشی ایسے ہی آدمی کی کہانی ہے جو اس دنیا کی آزمائشوں سے تنگ تھا اور خواہش کرتا تھا کہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح بے حس ہو جائے

"ایسا کر دے مجھے کچھ سنائی نہ دے، دکھائی نہ دے، بھوک لگے، نہ پیاس، نہ کسی کو روتا دیکھو نہ ہنستا، غصہ نہ آئے نہ رنج ہو، جھلاؤں نہ جھنجھلاؤں۔ ہاں ایسا کر دے جیسے پہاڑ، جیسے سمندر، جیسے کیلنڈر پر چھپی ہوئی تصویر۔ ہاں ایسا ہی ہیں جنہیں کوئی فرق نہیں

پڑتا، کچھ ہو جائے جائے کوئی فرق نہیں پڑتا"(۶۷)

ایسا احساس شخص جو دنیا کو بہت قریب سے دیکھتا اور سمجھتا تھا اور ہر پل خواہش کرتا تھا کہ اس سے یہ صلاحیتیں چھن لی جائیں اور وہ بھی باقی لوگوں جیسا ہو جائے۔ لیکن وہ مجبور تھا وہ ویسا نہیں بن سکتا تھا جیسا کہ وہ گمان کرتا تھا اسے دوسرے لوگوں جیسا ہونے پر اعتراض تھا

"تو وہ کروڑوں جیسا کیوں بنایا گیا۔ بنایا ہی جانا تھا تو مچھر سانپ یا بچھو یا کتا ھی بنا دیا گیا ہوتا۔
جنہیں فرق تو پڑتا ہے مگر کچھ زیادہ نہیں پڑتا۔ جو دیکھتے ہیں سنتے ہیں مگر کڑھتے نہیں ہیں"(۶۸)

حساسیت نے اسے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا اسے یہ خیال آنے لگا کہ اگر وہ ویسا نہیں بن سکتا تو اس کے بیوی بچوں کو ویسا بنا دیا جائے کہ جیسے وہ چاہتا تھا۔ ایک دن اس کے بیوی بچے وی ہی ہو گئے جیسا وہ گمان کرتا تھا اس پر اسے خوشی حاصل ہوئی لیکن زیادہ دیر تک نہیں وہ اردگرد کے ماحول اور لوگوں کو دیکھتا تو اندر ہی اندر کڑھتا کہ لوگ چل پھر رہے تھے لیکن اپنی آواز ہو چکے تھے۔ وہ اپنی ذات بھول چکا تھا اور اس دنیا سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے خودکشی کا راستہ اختیار کیا۔ اس غمزدہ زندگی سے نجات کا راستہ اسے خودکشی ہی نظر آیا۔

"اس کی نظر ایک قریب آتی ایک بس پر پڑی کہ جس میں تاریخی ٹھونسی تھیں۔
سب مہینے کی آخری تاریخیں، تو اس نے قہقہہ لگایا اور تیزی سے آگے بڑھ کر سڑک
پر لیٹ کر سڑک ہو گیا۔ فوراً بعد وہ ایک بے یقینی کی نیند سو رہا تھا اس نے خود کو اپنے
وجود کی قید سے آزاد کیا اور دنیا کے دکھوں اور غموں سے نجات حاصل کی کی اس کے
سوا اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔"(۶۹)

## سائنسی تشکیک

سائنس نے جہاں انسانی زندگی سہل کی وہاں ہی انسان کے لیے بے شمار مصائب بھی لے کر آئی۔ انسان نے رشتوں کی قدر کرنا چھوڑ دی۔ مشینوں کی ایجاد نے کام میں آسانی فراہم کی لیکن انسان کو اپنا غلام بنا دیا۔ گہما گہمی اور افراتفری اس دنیا میں انسان خود کو تنہا محسوس کرنے لگا۔ سائنس نے بم تو ایجاد کر لیا لیکن ان کا استعمال انسان کی زندگی کے خاتمے کے لیے ہی کیا جانے لگا اس سے انسان دشمنی کو فروغ ملا اس نے بے

شمار انسان فوائد کے لیے ایجادات کی لیکن انسانی جذبات اور احساسات کو نہ چھو سکیں یہ سائنس کی دسترس سے باہر رہے احمد جاوید نے صنعتی ترقی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے کیونکہ اس دور میں انسان ایسی ہی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جس میں بم دھماکوں کی آوازیں، بھاگ دوڑ، گہما گہمی اور گاڑیوں کا شور تھا۔ انسان ہمیشہ سے سکون کا طالب رہا ہے لیکن اس دور میں انسان کو سکون میسر آنا بہت مشکل کام تھا۔ انسان کو کیڑے مکوڑوں کی طرح مارا جاتا تھا، کمزور لوگوں پر ظلم کیا جاتا تھا ایسے معاشرے میں سکون میسر آنا ناممکن تھا۔ احمد جاوید کے افسانوں میں سائنس کی ترقی پر بھی طنز کیا ہے۔ احمد جاوید سائنسی ترقی تو چاہتے ہیں لیکن کچھ تلخ سوالات بھی سائنس کے سامنے رکھے ہیں جس نے انسانی زندگی کو کھیل بنادیا افسانہ گدھ میں دنیا کی گہما گہمی کو بیان کیا ہے جس کا موجب صنعتی ترقی کو قرار دیتے ہیں ۔

> ”سڑک پر آتا ہوں آوازوں کا اژدھام یہاں بھی دھکم پیل کرتا میرے آر پار ہوتا جاتا ہے۔ سڑک کا وہی عالم ہے کہ جو بازاروں میں ہوتا ہے مال آرہا ہے، مال جارہا ہے مگر کون آتا ہے؟ کون جاتا ہے، خریدار کون ہے، بیچتا کون ہے، لاتا کون ہے، پہچانتا کون یہ کسی کی صورت نظر نہیں آتی ایک آوازیں ہیں کہ بس وہی آتی ہیں باقی آدم نہ آدم کی نہ ذات۔“(۷۰)

دنیا کے ہنگاموں نے اس قدر انسان کو مصروف کر دیا یا کہ وہ نہ صرف لوگوں کو بلکہ اپنی شناخت بھول گیا۔ اسی افسانے میں آگے چل کر احمد جاوید آدمی کی تلاش میں نظر آتے ہیں جو کہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے

> ”سڑک پر ٹریفک کا اژدھام ہے۔ گاڑیاں۔ سائیکلیں تانگے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگے چلے جاتے ہیں۔ مگر سوار کہاں ہیں، وہ کہیں بھی نہیں ہیں جیسے سب اپنے آپ چلا جارہا ہو۔ اپنے آپ۔“(۷۱)

> ”آوازوں کا شور اور خالی گلیاں۔ میں یونہی کھڑا ادھر ادھر دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں آدمی؟ آوازوں سے شہر بھرا پڑا ہے۔ مگر آدمی؟ میں ان کا کیا کروں کیا کروں؟“(۷۲)

انسان مشینوں کا غلام بن کر رہ گیا اس کے پاس اس دوسرے لوگوں کے لیے وقت نہ رہا اور وہ اپنی ہی دنیا میں مصروف رہنے لگا۔ افسانہ پیادے میں احمد جاوید نے سائنسی ترقی کی تائید کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ سائنس انسان کے جذبات و احساسات کو دریافت نہ کر سکیں۔ سائنس پرانی اور بوسیدہ ہڈیوں سے انسانی عمر کا ،جانوروں اور پودوں کے متعلق معلومات مل سکتی ہے۔ لیکن جن مسائل کا انسان نے سامنا کیا ان کا حل سائنس کے پاس موجود نہیں ۔ سائنس یہ بتانے سے عاری ہے کہ گزرے ہوئے شخص نے کس قسم کی خواہشات لے کر زندگی گزاری۔ کیسے جذبات اس کے اندر تھے وہ کیا چاہتا تھا یہ علم سائنس کو آج تک حاصل نہ ہو سکا۔ افسانہ پیادہ میں لکھتے ہیں

"مجھے جب دریافت کیا جائے گا میری ہڈیوں سے میرے زمانے کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔ میری موت طبعی تھی یا غیر طبعی معائنے کے بعد ثابت ہو جائے گا، مگر زندگی وہ دریافت نہیں ہو گی اور نہ ہی میرے خواب اور میری آنکھیں۔" (۴۳)

انسان کی موت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن کس طرح کے جذبات لے کر وہ اس موت کا شکار ہوا یہ کوئی نہیں بتا سکتا اور نہ ہی ان کی حالات زندگی کوئی دریافت کر سکتا ہے احمد جاوید لکھتے ہیں

"جب کھدائی پر شہر دریافت ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ ساتھ ان کی صبحیں اور شامیں دریافت نہیں ہوتی صرف عمارتوں کے کھنڈر سامنے آتے ہیں وہ پھول جو جوڑوں میں سجائے گئے، جو گجرا بنائے گئے جو پاؤں تلے مسل دیے گئے کون ڈھونڈتا ہے اور کون ڈھونڈتا ہے موسم جو دل میں اترے ہیں چھوٹے چھوٹے کھلونے ضرور دریافت ہوتے ہیں مگر آنکھوں کی لالی، ہونٹوں کی جنبش، ماتھے کی شکنیں یہ سب دریافت نہیں ہوتے" (۴۴)

سائنس نے بم تو ایجاد کر لئے لیکن ان کے استعمال کے بعد ہونے والی تباہی میں انسان کی پکار نہ دریافت ہوئی۔ ہڈیوں کے ڈھانچوں سے صرف عمر کا اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا ان کی خواہشات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ڈھانچے نہ بول سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں۔ اسی طرح جنگ میں مارے جانے والے ہزاروں لوگ ایسے تھے جو اپنی جانیں قربان کر کے لیکن ان کی شناخت کا مسئلہ اب تک ہے۔ جنگ کے دوران جن ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال کیا جاتا ہے وہ تاریخ میں رقم ہوتے ہیں اور عجائب گھروں کی زینت بن جاتے ہیں۔ تلواریں اور ڈھالیں وغیرہ

لیکن انسانی زندگی نہ کوئی دریافت کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی حل نکال سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان عدم تحفظ کا شکار ہوا تو انسان نے خارج کی دنیا کو چھوڑ کر اپنے داخل کی طرف رجوع کیا۔

احمد جاوید نے جس دور میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا اس وقت ملکی حالات سخت خراب تھے تقسیم کے بعد ملک میں اب تک وہ امن و امان نہ قائم ہو سکا جس کی خاطر آزادی حاصل کی گئی تھی لاکھوں لوگوں کی قربانیاں دینے کے بعد وطن عزیز میں سیاسی معاشی اور معاشرتی ہر سطح پر بحران تھا تقسیم کے بعد ملک سیاسی اتار چڑھاؤ کا شکار ہوا مارشل لاء نافذ ہوئے شہری گٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے ہجرت کے دکھوں نے انسانوں کو اندر تک زخمی کیا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس ملک کے باسی بنے۔شہریوں کے ساتھ طرح طرح کی نا انصافیاں کی جانے لگی جب ملک کی حالات مزید خراب ہوئے تو عوام سے حق آزادی اظہار رائے بھی چھین لیا گیا اب وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم وستم کے خلاف آواز بھی نہیں بلند کر سکتے تھے۔اس گھٹن زدہ زندگی سے لوگ بیزار نظر آنے لگے اور وہ اپنی مادی زندگی کو چھوڑ کر داخل کی طرف متوجہ ہوئے دنیا کی گہما گہمی نے انہیں اپنی اصلیت کی تلاش پر مجبور کر دیا انسان لوگوں کی بھیڑ میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگا اس طرح ہر فرد کے اندر اپنی شناخت کا مسئلہ پیدا ہوا وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ اس دنیا میں اس کی کیا حقیقت ہے وہ کیوں ہے اصل حقیقت کیا ہے۔یہ وہ سوالات ہیں جو ازل سے انسان کے اندر رہے ہیں لیکن جب انسان کے خارجی حالات بھی اس کے موافق نہ رہے تو ان سوالات نے مزید شدت اختیار کر لی۔اردو ادب میں بھی اس رجحان نے جگہ بنائی فنکار اپنی تخلیق میں اب داخلی کیفیات کو بھی جگہ دینے لگے اور خارج کے ساتھ ساتھ داخلی کشمکش کو بھی موضوع بنایا جانے لگا۔یہاں سے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اسی دہائی میں وجودیت کی تحریک بھی اردو ادب میں داخل ہوئی اگرچہ اس تحریک کچھ افکار کی طرف ہمارے ہاں زیادہ توجہ نہیں دی گئی لیکن باوجود اس کے اس کا اثر اس دور کی تحریروں میں نمایاں ہے اس کے ساتھ ملک کی سیاسی و معاشی ابتری نے انسان کو گہرا صدمہ پہنچایا جس کی وجہ سے وہ ان حالات میں اپنی اندرونی کیفیات کو بزبان قلم پیش کرنے پر آمادہ ہوا۔

وجودیت اگرچہ مایوسی و اداسی کا رویہ ہے لیکن دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو اس نے مشرق میں مسائل میں گھرے ہوئے آدمی کے لیے امید کا راستہ بھی اپنے ساتھ لایا ہے یہ بات بات تسلیم کی جاتی ہے کہ یہاں داخل کی طرف رجوع یا عرفان الٰہی کا تصور کچھ نیا نہیں تھا لیکن خارجی حالات کے باعث بحران زدہ عوام کے لیے

ایک ایسا راستہ بھی تھا جہاں وہ صبر و تحمل سے کام لیں اور ان حالات پر قابو پائیں احمد جاوید نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۶۶ء میں کیا لیکن ان کی واضح پہچان کی دھائی سترّ کی ہے ان کے افسانے علامتی انداز میں ہیں ہیں اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو اس دور میں نیازانہ تخلیق کیا جا رہا تھا جس میں نئے موضوعات تھے اور علامتی دور کا آغاز ہو چکا تھا دوسری بڑی وجہ اس دور میں اظہار بیان پر پابندی تھی جس کے باعث ادیبوں نے علامتی اور استعاراتی انداز میں ادب تخلیق کیا اور سیاسی صورتحال پر طنز کیا۔ احمد جاوید نے بھی علامتی انداز میں نہ صرف خارجی ماحول پر تنقید کی بلکہ فرد کی داخلی کیفیات کو بھی افسانے کا موضوع بنایا انہی موضوعات نے احمد جاوید کے افسانوں پر وجودیت کے اثرات بھی مرتب کیے۔ احمد جاوید نے فرد کی داخلی کیفیات اور واردات ک بیان کیا۔ جن کی وجہ سے اس کو فکر اور اندیشہ لاحق تھے یہ فکر اور اندیشے احمد جاوید کو خارجی حالات کے باعث لاحق ہوئے ہیں ان حالات نے انسان کو بکھیر کر رکھ دیا وہ صرف خواہشات اور خواب لے کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گیا احمد جاوید ایسی کہانیاں بیان کی ہیں جو اندر سے ٹوٹے ہوئے انسانوں کی ہیں۔ انسان دکھ اور درد کا مارا ہوا انسان ہے۔

احمد جاوید کے افسانوں میں داخلیت کا عنصر نمایاں ہے ان کے کردار اندر کی آواز سنتے ہیں اور تذبذب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ آیا یہ آواز اندر سے ہے یا باہر سے وجود کے اندر ایک عجیب لڑائی ہے خیالات گتھم گتھا ہیں۔ وہ داخل کو ایک بند کمرے کی طرح سمجھتے ہیں اگر اس تک رسائی حاصل کی جائے تو باہر سے ہو کر جیسا انسان خیال کرتا ہے ویسا اندر بالکل بھی نہیں ہے احمد جاوید نے اندر کی دنیا کو پرسکون دکھایا ہے جہاں باہر کی گرمی سے کہیں زیادہ خنکی ہے اور اس کے اندر داخل ہونے کے لیے جذبے کے بھی حامی ہیں۔ اگر انسان میں گریبان چاک کرنے کا حوصلہ ہو، طلب کی پیاس ہو تو انسان اپنے آپ کو پہچان سکتا ہے

وہ خارجی حالات کے باعث ناامید لوگوں کو اس بات کا یقین دلاتے ہیں کہ انتظار کریں کہ ہر موسم نے بدلنا ہوتا ہے موسم کو علامتی انداز میں اظہار کیا ہے دراصل ہو اس وقت کے حالات کے بدلنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اکثر انسانوں میں یہ عنصر دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو بھی ناامیدی کی طرف مائل نہیں ہونے دیتے ہیں بلکہ امید کی ڈور سے بندھے رکھتے ہیں اور اچھے وقت کے آنے کی نوید سناتے ہیں احمد جاوید کے اندر امید کے ساتھ وقت اور حالات بدلنے کا یقین محکم ہے اور وہ اس کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہیں ان کے خیال میں امید ایک بے اختیار چیز ہے جس پر ہمارا کوئی اختیار نہیں اور وہ ہمارے دلوں سے کہیں نہیں جا سکتا

انسان کی بے یقینی کی کیفیت پر طنز کرتے ہیں کہ جب برے حالات ذرا طول پکڑ جائیں تو انسان کو بس یونہی بے یقینی سی ہو جاتی ہے حالانکہ کہ وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا اس نے بدلنا ہے۔ خارجی حالات کے باعث پھیلی انسان کی اندرونی گھٹن پر سخت تنقید کرتے ہیں حبس کا موسم اور اس سے متعلقہ حشرات کا ذکر ملتا ہے جس طرح پتنگ حبس کے دلوں میں روشنی پر جمع ہوتے ہیں اسی طرح آزادی کے متلاشی ہلکی سی آواز پر جمع ہو جاتے ہیں وہ آزادی کی خاطر کٹ مرنے تک تیار ہوتے ہیں۔

اس گھٹن زدہ فضا میں وہ سانس لینے میں دشواری محسوس کرتے ہیں غیر علامتی افسانوی مجموعہ میں بیشتر کہانیاں ہیں حبس کے ذنوں پر ہیں اور جس کے باعث پھلی گھٹن کو موضوع بنایا ہے دراصل حبس کو مارشل لاء کے باعث پھیلے خوف وہراس سے تعبیر کیا ہے ہر طرف خوف کی فضا چھائی رہتی ہے دشمن کا خوف، پولیس کا خوف اور وحشی صفات انسانوں سے خوف دیکھنے کو ملتا ہے ایسے معاشرے میں انسان عدم تحفظ کا شکار تھا کہیں کوئی جائے امان نہ ملتی تھی۔ احمد جاوید اس کی قید و بند کی صورتحال سے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کے لیے وہ پرندوں کو آزادی کا استعارہ خیال کرتے ہیں جیسے پرندے آزاد صفت ہیں اسی طرح انسان بھی اپنی فطرت میں آزاد واقع ہوا ہے وہ زیادہ دیر تک پابندی یا قید کو برداشت نہیں کر سکتا ہے وہ دنیا کو ایک پنجرا تصور کرتے ہیں جہاں سب پرندے اور انسان قید ہیں وہ اس بات پر شدید کڑھتے ہیں کہ کیا انسانوں کو بھی کیا جا سکتا ہے انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے اسے کیونکہ قید کیا جارہا ہے جبکہ قید تو ان درندہ صفت جانوروں کے لئے ہے جو نقصان کا باعث بنتے ہیں۔

احمد جاوید نے رشتوں کی اقدار کھونے پر بھی طنز کیا ہے وہ دنیا کو بے معنی ہیں خیال کرتے ہیں اس دنیا میں میں جو دن گزرتا ہے وہ صرف اپنا مقدر کو سنوارنے کے لیے گزر جاتا ہے باقی یہاں رہنے کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا آدمیوں کو جنگل کے درخت تصور کرتے ہیں نہیں۔ انکے افسانوں میں موت کا عنصر زیادہ تو نہیں دیکھنے کو ملتا لیکن کہیں ان کے کردار اس بے معنی دنیا سے بیزار نظر آتے ہیں اور خودکشی کو ہی اس دنیا کے مسائل کا حل جانتے ہیں کے اس کے علاوہ وہ اپنی حساسیت پر بھی طنز کرتے ہیں اور اس کے بارے میں فکر مند ہیں اور ان کو اس قدر حساس نہ بنایا ہوتا وہ بھی بے حس لوگوں اور حشرات کی طرح ہوتا جن پر ان حالات کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ معمولی باتوں کو زیادہ محسوس نہیں کرتے۔

سائنسی ترقی پر بھی تنقید کی ہے ان کے خیال میں سائنس کا کی چیزوں کا حل تو نکال سکتی ہے لیکن انسانی جذبہ کا حل سائنس کے پاس موجود نہیں ہے سائنس نے انسانی بوسیدہ ہڈیوں سے انسان کے پرانے ہونے کا اندازہ تو دل لگا لیا لیکن یہ نہ جان سکیں کہ اس انسان کے جذبات کیا ہے کیا وہ رات کو لے کر اس دنیا سے چلا گیا انسان جنگوں میں مارے جاتے ہیں تلواریں تالے ہم اور باقی استعمال ہونے والے اوزار تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں لیکن انسانوں کا کیا جو مارے گئے ہیں ان کی کوئی شناخت نہیں۔ احمد جاوید کے افسانوں میں رجای وجودی عناصر اور قنوطی عناصر دونوں موجود ہیں وہ خارجی حالات سے پریشان ہیں لیکن امید کا عنصر غالب ہے جو مایوسی کی طرف نہیں مائل ہونے دیتا۔ وہ انسان کو حالات کے بدلنے اور ان سے لڑنے پر آمادہ کرتے ہیں ان کے افسانوں میں سیاسی صورتحال پر شدید تنقید ہے لیکن آس ہے کہ ان کے اختیار میں نہیں وہ مایوس ضرور ہیں لیکن امید بھی ہے کہ وقت بدلے گا۔

## حوالہ جات


۱۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی (افسانوی مجموعہ)، خالدین، لاہور، ۱۹۸۳، ص ۸

۲۔ ایضاً، ص ۹

۳۔ سلطان علی شیدا، وجودیت پر ایک تنقیدی نظر، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۷۸، ص ۲۷

۴۔ یوسف حسن، احمد جاوید کی افسانہ نگاری، مشمولہ، فنون، لاہور، جنوری اپریل، ۱۹۹۳، ص ۳۱۵

۵۔ احمد جاوید، چڑیا گھر (افسانوی مجموعہ)، گندھارا بکس، لاہور، ۱۹۸۳، ص ۲۲۹

۶۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی (افسانوی مجموعہ)، خالدین، لاہور، ۱۹۸۳، ص ۲۶۹

۷۔ احمد جاوید، چڑیا گھر، ص ۲۲۲

۸۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، ص ۳۱۸

۹۔ ایضاً، ص ۲۲۴

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۲۴

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۲۰

۱۲۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، ص ۳۲۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۳۲۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۲۷

۱۵۔ احمد جاوید، چڑیا گھر، ص ۲۳۱

۱۶۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، ص ۲۵۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۵۸

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۵۹

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۶۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۶۲

۲۱۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، ص ۲۸۶

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۹۲

۲۳۔ احمد جاوید، گمشدہ شہر (افسانوی مجموعہ)، گندھارا بکس، روالپنڈی، ۱۹۹۶، ص ۴۰۱

۲۴۔ ایضاً، ص ۴۰۱

۲۵۔ احمد جاوید، گمشدہ شہر، ص ۳۶۹

۲۷۔ ایضاً، ص ۳۶۹

۲۸۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، ص ۳۲۵

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۵۶

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۵۵

۳۱۔ احمد جاوید، چڑیا گھر، ص ۱۳۵

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۳۳۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، ص ۲۳۹

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۴۰

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۵۳

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۵۵

۳۷۔ ایضاً، ص ۲۵۱

۳۸۔ ایضاً، ص ۲۶۵

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۵۵

۴۰۔ احمد جاوید، چڑیا گھر، ص ۱۵۲

۴۱۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۴۲۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، ص ۲۴۸

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۴۸

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۴۸

۴۵۔ ایضاً، ص ۲۵۰

۴۶۔ ایضاً، ص ۲۵۱

۴۷۔ احمد جاوید، چڑیا گھر، ص ۱۶۴

۴۸۔ ایضاً، ص ۱۶۴

۴۹۔ ایضاً، ص ۱۶۵

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۶۶

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۶۸

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۵۷۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۵۸۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، ص ۳۰۳

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۸۷

۶۰۔ ایضاً، ص ۳۰۴

۶۱۔ ایضاً، ص ۳۰۰

۶۲۔ ایضاً، ص ۳۰۰

۶۳۔ احمد جاوید، گمشدہ شہر، ص ۳۸۶

۶۴۔ احمد جاوید، چڑیا گھر، ص ۱۸۵

۶۵۔ ایضاً، ص ۱۸۴

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۸۷

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۶۸۔ احمد جاوید، گمشدہ شہر، ص ۴۰۷

۶۹۔ ایضاً، ص ۴۰۸

۷۰۔ ایضاً، ص ۴۱۰

۷۱۔ ایضاً، ص ۳۷۳

۷۲۔ ایضاً، ص ۳۷۴

۷۳۔ ایضاً، ص۳۷۵

۷۴۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، ص۳۷۶

# باب چہارم

## مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے افسانوں میں

## اشتراکات وافتراقات

مظہر الاسلام اور احمد جاوید ہمعصر افسانہ نگار ہیں دونوں افسانہ نگار کا تعلق پاکستان سے ہے۔ مظہر الاسلام نے اپنی افسانہ نگاری کا آغاز ۶۰ء کی دہائی میں کیا جب کہ احمد جاوید کی پہلی کہانی بھی ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی لیکن باقاعدہ افسانہ نگاری ۷۰ ءکی دہائی کی ہے جو ان کی پہچان بنی۔ ساٹھ کی دہائی میں وجودیت کی تحریک اردو ادب میں ظہور پذیر ہوئی اس کے ساتھ ساتھ ملک کی سیاسی اور سماجی حالات اس قدر انتشار کا شکار تھے کہ لاشعوری طور پر بھی وجودی عناصر نے ادب میں جگہ بنائی۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ، مارشل لاء اور اظہار پر کڑی پابندیوں نے انسانی زندگی کو لغو بنادیا۔ مشینی ترقی نے گھما گھمی پھیلادی۔ انسان جب اپنا تشخص برقرار نہ رکھ سکا تو اس نے داخل کی طرف رجوع کیا۔ مظہر الاسلام ساٹھ کے افسانوں میں گہرا سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ وجودی عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں اگرچہ اظہار پر پابندی تھی لیکن مظہر الاسلام نے علامتی انداز میں ان تمام حالات پر کڑی تنقید کی ہے۔ اس وقت عوام نے جن مصائب کا سامنا کیا وہ مظہر الاسلام کے کرداروں میں دکھائی دیتے ہیں۔ مظہر الاسلام لکھتے ہیں

> ”مجھے ایک کہانی کتنی مہنگی پڑتی ہے۔ جب کسی کہانی پر کام کر رہا ہوتا ہوں تو بہت سے لوگوں اور چیزوں سے میرا ذہنی رابطہ منقطع ہو جاتا ہے لکھنے کے لیے بہت سی اداسی، تھوڑی سی یادیں، لمبا انتظار گھنی اور خالص تنہائی اور تھوڑی سی چاہے بہت ضروری ہے۔ کہانی لکھنا مجھے اچھا لگتا ہے مگر یہ میرے لئے عذاب ہے کہانی میرا خون پیتی ہے۔“(۱)

ڈاکٹر صفیہ عباد لکھتی ہیں

> ”مظہر الاسلام کی کہانی ان کی اپنی ذات سے پیدا ہوئی ہے انہیں جیسی باتیں کرتی ہے اس میں زندگی کا ہر رنگ اور ہر سانس ہے۔ کہانی ان کے نزدیک ایک جیتی

جاگتی بات ہے۔"[۲]

احمد جاوید نے ۷۰ء کی دہائی میں اپنی واضح پہچان بنائی ان کی کہانیوں میں بھی سماجی اور سیاسی حالات کا گہرا احساس دیکھنے کو ملتا ہے۔ اکثر کہانیوں میں گھٹن زدہ ماحول، حبس کا موسم اور جبری صورتحال کا ذکر ملتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف شدید احتجاج بھی نظر آتا ہے۔ مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے افسانوں میں وجودیت کے تناظر میں اشتراکات دیکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں وجودی عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس وقت کے معاشرتی حالات نے انہیں ایسا لکھنے پر مجبور کیا جو کہ وجودیت کے زیر اثر نظر آتا ہے۔

## کرب، لایعنیت

مظہر الاسلام کے افسانے میں وجودی کرب موجود ہے۔ اکثر کردار یہ بے معنی اور بے مقصد زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ وہ اپنے وجود کو مقید سمجھتے ہیں۔ جیسے افسانہ پاگل، لائین مین شہر کی شکایت کس سے کرے، پنجرا میں وجود کا کرب موجود ہے جو کہ ہر قدم پر یہ دہائی دیتا نظر آتا ہے۔ افسانہ پنجرہ کا مرکزی کردار بے معنی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور وہ خود کو وجود کے پھندے میں قید تصور کرتا ہے سالگرہ کی مبارکباد پر اس کا رد عمل کچھ یوں ہوتا ہے "میں تو قیدی ہوں تم نے مجھے احساس دلایا کہ مجھے پورے ۳۷ سال ہو گئے ہیں قید میں"[۳] مذکورہ بالا افسانے کا کردار خارجی ماحول کی سختیوں سے تنگ آکر اس وجود کے پنجرے سے چھٹکارا حاصل کرلیتا ہے اس کا دوست اس کی کیفیت بیان کرتا ہے

> "اس کی کیفیت اس مسافر جیسی ہو جایا کرتی تھی جو اپنا سامان باندھ کر سفر کے لیے تیار بیٹھا ہو صرف زندگی کے پاسپورٹ پر امیگریشن سیل کی مہر لگی رہ گئی ہو۔"[۴]

اسی طرح افسانہ لائن مین شہر کی شکایت کس سے کرے، میں لائن مین شہر کی ناقابل برداشت صورتحال کو بیان کرتا ہے اور زندگی کی مہملیت پر پریشان دکھائی دیتا ہے

> "ماں لوگوں میں معاف کرنے اور در گزر کر دینے کا جذبہ مر گیا ہے وہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بڑی بڑی سزا تجویز کرنے کے عادی ہو گئے ہیں وہ سختی پسند کرنے لگے ہیں۔ اب تو وہ اپنے فیصلے بھی خود نہیں کر پاتے۔"[۵]

مظہر الاسلام نے اکثر افسانوں میں اسی کرب کے باعث اس دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنے والوں کو موضوع بنایا ہے۔ شہر میں پھیلی منافقت اور خوشامد جیسے زہر پر کڑی تنقید کی ہے جس نے زندگی کو لغو بنا دیا ہے۔ یہی وجودی کرب احمد جاوید کے افسانہ نہ دم دار ستارے کے کردار میں بھی نظر آتا ہے

" ہم خوش ہیں آج ہماری سالگرہ ہے ہم یہ دن منایا کرتے۔ ہم سب کبھی اسی
روز پیدا ہوئے تھے اس دن کی یادیں میں ہمیں چوسنیاں مہیا کی گئی ہیں۔
بب باندھے گئے ہیں۔ ہم پر جو میٹ مقرر ہیں انھیں پنگھوڑے بھی عطا
ہوئے ہیں۔"(٦)

ان کے افسانوں میں اندرون ملک جو حالات بدلے ان کا منظر نامہ ملتا ہے انسان جو اپنی شناخت کھو چکا تھا ہر طرف ہجوم تھا اور دھکم پیل کی عکاسی کرتے ہیں۔ رشید امجد، احمد جاوید کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں" احمد جاوید کی کہانی میں بنیادی حیثیت اس منظرنامے کو حاصل ہے جس میں ان کی کہانی گھومتی ہے"(٧) احمد جاوید کے افسانوں میں فکری ترجمان ان کی منظر کشی ہے۔ وہ اپنے اردگرد سے کردار لیتے ہیں اور ان کے ذریعے زندگی کی لغویت کو بیان کرتے ہیں۔ افسانہ کبوتر بھی وجودی کرب کی مثال ہے۔ جزیروں کی خبر لانے والے سمندری پرندے اور پرندوں پر جھپٹنے والے پرندے۔ سب پابند ہیں کوئی آزاد نہیں آسمان اور زمین کے درمیان ایک پنجرے میں پھڑ پھڑاتے ہیں۔

### تنہائی، اداسی

مظہر الاسلام کے افسانے میں تنہائی اور اداسی کی فضا چھائی ہوتی ہے اور تنہائی اس قدر ہے کہ کردار اس سے کبھی کبھار لذت لینے لگتے ہیں وہ ہجوم کی اس دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتے ہیں اور یہی تنہائی چھوٹی چھوٹی باتوں تو محسوس کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے وہ دنیا کی گھما گھمی سے کہیں دور تنہا رہنا پسند کرتے ہیں۔ بیشتر کردار تنہائی اور اداسی کو پسند کرتے ہیں کہانی سے باہر گرا ہوا بابا کا کردار نوجوان تنہائی میں رہنا پسند کرتا ہے نوجوان بابا سے مخاطب " بابا میں تنہائی کی بھوک کاٹتا ہوں لمبی بھوک بولا یہ اچھی بات ہے تنہائی کی کی بھوک کے بعد جب کوئی ملتا ہے تو بس کچھ نہ پوچھو۔"(٨) مظہر الاسلام کے زیادہ تر افسانوں کے کردار اسی تنہائی اور اداسی کا شکار ہیں جس کے باعث اس وہ خودکشی بھی کر لیتے ہیں ۔احمد جاوید بھی اس دنیا کے ہنگامے سے الگ رہنا پسند کرتے ہیں افسانہ کہانی کی گرہ کا کردار جو تنہائی میں لذت محسوس کرتا ہے وہ کہتا ہے

"میں کہانی لکھتا ہوں اور یوں خود کو کبھی کبھی ہجوم سے جدا کر لیتا ہوں ہو
تم اس لذت کو کیا جانوں جب میں اپنی ذات سے الگ انجانی دنیاوں کے
سفر پر ہوتا ہوں تو واپسی پر میری جھولی خوشبو سے بھری ہوتی ہے۔"(۹)

دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں تنہائی کا عنصر موجود ہے تنہائی کرداروں کو اپنی ذات سے آگہی کی طرف لے جاتی ہے مظہر الاسلام کے افسانوں کے زیادہ کردار اس تنہائی میں نفسیاتی صورتحال کا سامنا بھی کرتے ہیں جبکہ احمد جاوید کے ہاں تنہائی بھی خود آشنائی ہے اور وہ اسے محظوظ ہوتے ہیں۔

## خوف اور وحشت

دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں یہ وجودی عناصر موجود ہیں۔ چاہے وہ کسی دشمن کا خوف ہو، کسی انسان کا خوف یا کسی اور بیرونی طاقت کا خوف ہو۔ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں خوف دیکھنے کو ملتا ہے۔ مظہر الاسلام باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، افسانوی مجموعے، کے دیباچے میں رقمطراز ہیں "آج کل تو خوف کا موسم ہے وہ تو اس عہد کا استعارہ ہے۔"(۱۰) یہ خوف زدہ فضا مظہر الاسلام کے تقریباً تمام افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مظہر الاسلام نے ۷۰ء کی دہائی میں لکھی گئی کہانیوں میں خوف کی فضا بہت واضح ہے۔ معاشرہ جن بیماریوں کا شکار ہو چکا تھا اور اعلی حکام کی بے اعتدالی نے خوف اور وحشت کو جنم دیا۔ ڈاکٹر صفیہ عباد اس حوالے سے لکھتی ہیں

" مظہر الاسلام کی وہ کہانیاں جو بالخصوص ستر کی دہائی میں لکھی گئی ہیں ہیں ان
میں یہ رنگ بہت نمایاں ہے اجتماعی خوفزدگی، زندگی سہمی ہوئی اس میں نظر
آتی ہے۔ خیالات پابند سلاسل ہیں ایسے عالم میں تمام کی تمام کہانیاں خوف
اور چپ کے دھاگوں سے سلی ہوئی ہیں۔"(۱۱)

افسانہ کہانی کی مٹھی میں ڈرامہ، اس خوف زدہ فضا پر تنقید ہے

"خوفزدہ زندگی کس کام کی۔ ابھی کوئی پکڑلے گا، ابھی کوئی
پکڑلے گا اسی طرح کی بے چینی اور خوف میں ڈوبی ہوئی زندگی
بے، بس چوہے کی طرح ہے۔"(۱۲)

دراصل انسان کے حقوق کی پامالی پر انہیں اس معاشرے سے وحشت سی محسوس ہونے لگی جس کے باعث انسان کے اندر جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ اکثر کردار دم گھٹنے کی شکایت کرتے ہیں اس کی وجہ وہ یہ گھٹن زدہ ماحول تھا جس میں انسان خود کو قید تصور کرتا تھا اور قید میں سانس کی تکلیف محسوس کرتا تھا۔لائن میں اپنی ماں سے سے دم گھٹنے کی شکایت کرتا ہے "ماں میں اب تھک گیا ہوں میرے اندر برداشت ختم ہو گئی ہے۔ مجھ سے شہر کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔"(۱۳)

افسانہ پنجرہ کا کردار بھی اسی وحشت کا شکار ہے

" وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو کو شدت سے محسوس کرنے لگا تھا کبھی یوں لگتا تھا جیسے
سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ ٹینشن کی وجہ سے اس کا معدہ بھی
خراب ہونے لگا تھا وہ اکثر دم گھٹنے کی شکایت بھی کرنے لگا تھا۔"(۱۴)

احمد جاوید کے افسانوں میں وحشت اور گھٹن کی کیفیت ہے اس وحشت کے پیچھے سماجی بے اعتدالی، معاشرتی ناہمواری اور کمزور طبقے پر ظلم و ستم ہے۔ مثلاً افسانہ بھیڑیے میں انسانی شکل اور بھیڑیے میں صرف اتنا سا فرق باقی رہ گیا ہے ۔"ماسوا اس کے کہ جب کبھی کسی نحیف، کم نصیب بھیڑ یا بکری کو بے صبر دیکھے تو بھیڑیے کی طرح غراتے ہیں اور جھپٹ پڑتے ہیں۔"(۱۵) احمد جاوید نے علامتی انداز میں انسانی ظلم کو بھیڑیا کہا ہے اور وہ انسانوں کے اس رویے سے سخت نالاں ہیں۔ اسی طرح کتے کی آوارہ موت میں پھیلی خوفزدگی کو یوں بیان کیا ہے ۔

"کتوں کے اٹھ جانے سے بالکل سناٹا ہو گیا ہے دن کا کیا تھا وہ تو بھاگ دوڑ
میں گزر جاتا تھا رات گزارنی مشکل ہو گی۔ ہر وقت خطرہ لگا رہتا۔ ہلکی
سی آہٹ ہوتی اور دل بیٹھنے لگتا۔ "(۱۶)

احمد جاوید نے گلی محلے میں پھیلی ہوئی وحشت کو بیان کیا ہے۔ ہنگامی صورتحال کے باعث پھیلی اجتماعی خوفزدگی احمد جاوید کے ہاں دیکھنے کو ملتی ہے

"گلی محلوں کی رونق شام سے پہلے عروج پر آجاتی ہے کہ بچے گلیوں میں ہجوم
کرتے ہیں۔ مگر یہ خاموشی، میں حیران سا اٹھتا ہوں ارد گرد نگاہ کرتا ہوں کے

اچانک ایک تیز سنسناتی ہوئی آواز چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ سائرن جیسے
جنگ کے دنوں میں بجتے ہیں۔ میں حیران ہوتا ہوں کچھ لوگ ادھر ادھر
بھاگے آتے ہیں اور گلی کے وسط میں چھلانگ لگاتے ہیں۔"[۱۷]

بم دھماکوں کی وجہ سے پھیلی خوف وہراس کی اس فضا کو انہوں نے اکثر اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ آسیب زدہ رات، اسی سلسلہ کی ایک کہانی ہے۔ پوری کہانی کی فضا میں خوف طاری رہتا ہے کہ پابندیوں کے باعث جو شہریوں کے ساتھ ساتھ سلوک کیا گیا اور جو عوام کے دلوں میں خوف پھیل گیا وہ کسی صورت جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"ہزاروں راستے تھے ان دنوں بھی جب میں چھوٹا تھا۔ مگر اس وقت میں دوسروں
کی اماں میں تھا۔ دوسروں کی حفاظت کا بوجھ آن پڑا تھا۔ سب سوتے تھے میں
جاگتا تھا۔ خوف تھا، وسوسہ تھا، اندیشے تھے، طویل رات کٹتی نہ تھی۔"[۱۸]

احمد جاوید کہتے ہیں کہ خوف کے دنوں میں انسان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے ہتھیار ڈال دیے اور حکم کا پابند رہے۔ "جلسہ گاہوں اور جلوسوں میں جب بھگدڑ مچتی ہے، ڈر بولتا ہے، خالی مکانوں اور بے آسرا لوگوں پر حکومت کرتا ہے۔ ڈر کا قانون چلتا ہے۔"[۱۹] سیاسی جبر پر شدید تنقید کی گئی ہے جو ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کی طرح شروع ہو گیا تھا۔ شہریوں کے بعد اس کے سوا کوئی حل نہ تھا کہ وہ حکم کے پابند رہیں۔ یہ وحشت اس وقت مزید بڑھتی دکھائی جاتی ہے جب حبس کا موسم ختم ہونے کا نام نہیں لیتا اور گھٹن بڑھتی جاتی ہے۔ احمد جاوید لکھتے ہیں "کتنے دنوں سے ہوا نہیں چلی بارش نہیں ہوئی، مجھے اس رکے ہوئے موسم سے وحشت ہوتی ہے مگر اب بادلوں کے جمع ہونے سے بھی ڈر لگتا ہے۔"[۲۰]

## حریت پسندی

مظہر الاسلام اور احمد جاوید دونوں حریت پسند افسانہ نگار ہیں۔ مظہر الاسلام اپنے وطن، اپنی مٹی سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ معاشرے کے بدنما رنگ پر طنز کرتے ہیں۔ معاشرے کے منفی رویوں سے نفرت کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے وطن کی حفاظت اور نئی صبح کی امید بھی دلاتے ہیں۔ ان خدشوں سے آگاہ کرتے بھی نظر آتے ہیں جو ملک کو مزید نقصان کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صفیہ عباد اس حوالے سے لکھتی ہیں

"پھر بھی اسے اپنی مٹی سے محبت ہے۔ وہ مٹی نہیں ہے جسے سماج کی آلودگیوں نے بدکردار بنادیا بلکہ وہ مٹی اس کی شناخت بنی جس میں اس کی جڑیں ہیں جو اس کی جنم گاہ ہے۔ جو قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی وہ اس مٹی کا محافظ ہے اور اس کی سلامتی کے لیے لکھتا ہے۔"(۲۱)

روئی کا بادباں، زمین کا اغوا افسانے حصول آزادی کی مثال ہیں زمین کے اغوا میں باپ اپنے بیٹوں کو نصیحت کرتا ہے۔

"وہ مسافر پھر آئے گا تم اسے پہچان لینا اس کے ہاتھ کی انگلیاں چھ ہیں وہ تمہیں زیر کرنے کی کوشش کرے گا لیکن جب تک اس اونٹنی کے تھنوں میں دودھ کی ایک بوند بھی باقی ہے وہ ایسا نہ کر سکے گا اور جس نے اس کو اپنے علاقے سے نکال دیا تو تمہاری ساری سرحدیں پھیل جائیں گی۔ یہ مسافر پشتوں سے ہماری زمین چھیننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ہمارے آباؤاجداد کو زیر کرنے آیا تھا پہلے دھوکے سے کام لیتا تھا۔ لیکن اب وہ تم میں سے ہر ایک کے پاس آئے گا۔ چھوٹے بڑے کی تمیز میں مت الجھنا تم میں سے کوئی بھی زیادہ دولت مند اور چھوٹا بڑا نہیں تم سب ایک جیسے ہو۔"(۲۲)

دراصل ان ترقی یافتہ ممالک کی طرف اشارہ ہے جو کہ ترقی پذیر ممالک کو اپنی نو آبادی بناتے تھے اور وہاں کے وسائل کو اپنے ملک کی ترقی کے لئے استعمال کرتے تھے اور اس ملک کا استحصال کرتے تھے اس کے ساتھ ہی وہ یہ نصیحت بھی کرتا ہے کہ اپنی زمین کی حفاظت کرنا اولین فرض ہے۔ مظہر الاسلام کو اپنی مٹی سے گہری محبت ہے وہ اس کا تحفظ اور اسے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ "یادرکھ پتھر کی یہ سب چیزیں اس لئے حنوط کر لی گئی ہیں کہ انہوں نے اپنی زمین کی حفاظت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"(۲۳) مظہر الاسلام نے جنگوں میں مارے جانے والے عام لوگوں کے احساسات اور جذبات کو اپنی کہانی میں سمویا۔ آزادی کی خاطر جن لوگوں نے قربانیاں دیں جن ماؤں، بہنوں نے اپنے جوان بیٹے قربان کیے، ان کا ذکر تاریخ میں نہیں ملتا نہ ہی ان کی قربانیوں کا ذکر ہے۔ جنگ میں شہید ہونے والے نوجوان کا بھائی سوال کرتا ہے

"میری ماں نے تو کسی کو نہیں کہا کہ اسے اپنے بیٹے کے شہید ہونے کی تمنا تھی

جو پوری ہو گئی ہے۔ رہا میرا سوال تو بتا میں اس بھائی کو کس طرح بے مقصد
جنگوں کی آگ میں جھلسا کر خوش رہ سکتا ہوں۔"(۲۴)

معاشرے کے تلخ حقائق اور بد نما چہروں کو سامنے لانے کے باوجود مظہر الاسلام اپنے وطن سے کسی نفرت کا اظہار نہیں کرتے اور نہ اسے ترک کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو دھوکہ بازی۔ فریب، جھوٹ اور مکاری سے نفرت ہے جو کہ عوام کے کھوکھلے پن کی عکاسی کر رہی۔ ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنے ملک سے محبت کا اظہار کرتے ہیں گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو کہ دیباچے میں لکھتے ہیں

"کیا میں اپنے شہر کو اس لیے چھوڑ دوں کہ وہ ساری رات کھانستا اور کھانس کر اس کا
الٹنے لگتا ہے۔ دم بیمار دنوں میں اپنوں کو چھوڑ جانا اچھا نہیں۔ کیا ایسے میں محبت ختم ہو
جاتی ہے "(۲۵)

مظہر الاسلام ایسے محب وطن ہیں جو کہ زوال کے شکار معاشرے میں بھی اپنے وطن سے محبت کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پروفیسر فتح ملک مظہر الاسلام کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں

"بحیثیت فنکار مظہر الاسلام کا سب سے بڑا مطلب آزادی اظہار ہے۔
شاید یہی وجہ ہے کہ صحافت کے غلامانہ کردار پر اکثر اوقات چوٹ لگاتے ہیں۔"(۲۶)

مظہر الاسلام نے اپنی بیشتر کہانیوں میں آواز کے گم ہونے اخباروں پر گندگی کے ڈھیروں اور مکھیوں کا ذکر کیا ہے وہ خبروں کو محض گندگی کا ڈھیر سمجھتے ہیں جو صرف الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ دوسرے دن بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔

افسانہ متروک آدمی میں ایک کردار دوسرے سے سوال کرتا کیا ہے "گولی مارو تصویر کو یہ بتاؤ آج کی بڑی سرخی کیا ہے ہے وہی کل والی صرف لفظ بدل گئے" (۲۷) مظہر الاسلام میں اظہار پر پابندی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے وہ ملکی سرحدوں کی آزادی ہو یا اظہار کی مظہر الاسلام ہر قسم کی آزادی کے متمنی نظر آتے ہیں۔ احمد جاوید کے افسانوں میں بھی وہی مسائل دیکھنے کو ملتے ہیں جو مظہر الاسلام کے افسانوں میں ہیں دونوں افسانہ نگار چونکہ ایک ہی ملک سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم عصر بھی ہیں اس لئے دونوں کے افسانوں میں مسائل ایک جیسے ہیں۔ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں گردوپیش کے مسائل کو علامتی انداز میں اس طرح بیان کیا گیا کہ اظہار

پابندی منہ دیکھتی رہ گئی۔ احمد جاوید آزادی کے طلبگار ہیں افسانہ چڑیا گھر میں لکھتے ہیں ”پرندے ہمیشہ میرے لئے لیے فراغت اور آزادی کا استعارہ رہے ہیں“ (۲۸) آزادی پرندوں کی ہو یا جانوروں کی یا انسانوں کی ہمیشہ خوشحالی کا ضامن رہی ہے۔ لیکن وقت اور حالات ایک جیسے نہیں رہتے کبھی کبھی آزادی قیدی میں بدل جاتی ہے تب پرندوں، جانوروں اور یا انسانوں کو اپنی آزادی کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے مذکورہ بالا افسانے میں احمد جاوید ماضی کی آزادی کو یوں بیان کیا ہے

”وہ کیسے دن تھے جب خود چھت ہی آسمان تھا۔ جب چڑیاں منہ اندھیرے بولتی اور اپنا آشیانہ چھوڑ دیتی تو یوں لگتا جیسے میں نے اپنے پنکھوں لیے ہوں پھیلا لیے ہوں اور آسمان پر پرواز کے لئے نکل پڑا ہوں۔“(۲۹)

اس کے علاوہ طاقتور طبقے سے سے نچلے طبقے کی آزادی کے اور تلاشی بھی نظر آتے ہیں۔ ”سب طاقت کا کھیل تھا اب قرعہ میرے نام نکلا تو ہمیں اپنے ڈھنگ کی زندگی ملی۔“(۳۰) افسانہ کبوتر بھی آزادی کا متلاشی کردار ہے۔ کبوتر جس کو قید کیا گیا تھا شروع میں اس نے اس قید سے آزادی کے لئے ہر ممکن کوشش کی مگر سب رائیگاں گی۔ دراصل علامتی طور پر اس فعل پر طنز تھا کہ جس میں انسانوں کو قید کیا جاتا تھا۔ مذکورہ افسانے میں بھی وہ اپنے ماضی کو یاد کرتے دکھائی دیتے ہیں

”وہ بھی کیا رت تھی۔ جب شاخ شاخ جھولنے، اڑنے پھرنے کی آزادی تھی ندی نالوں پر پرواز کرنے، دور نکل جانے اور پھر لوٹ آنے کا اختیار تھا۔“(۳۱)

انسان ہو یا پرندے جب زیادہ دیر تک قید میں رہے تو وہ اپنی آزادی کی خواہش کو دبا لیتے ہیں۔ انسان اور پرندے فطرتاً آزاد واقع ہوے ہیں۔ ”وہ آدمی ہوں یا پرندے مجھے جب اڑھنے کی عادت بھول جائیں تو آخر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اپنے پنجرہ آپ ہو جاتے ہیں۔“ (۳۲) احمد جاوید نے آزادی اظہار کے لیے بھی جستجو کی زیادہ تر کہانیوں میں اظہار کے لئے آزادی کی خواہش ملتی ہے۔ افسانہ اور پھر خودکشی کا مرکزی کردار آواز کے گم ہونے پر حیران ہے کہ سارے عالم کا منظر اسے ایسا دکھائی دیتا ہے ۔

” تو وہ ہنستا قہقہے لگاتا، گلی گلی، سڑک سڑک گھومنے لگا اور جھومنے لگا کے باہر کا منظر بھی گھر سے کچھ جدا نہ تھا، کہ لوگ حرکت میں تو تھے مگر ان کے لب آواز سے

عاری تھے۔ تو ہر طرف چپ تھی ہو کا عالم تھا تو کہیں چیخ وپکار نہ تھی آہ و بکا نہ
تھی۔ لوگوں کا اژدھا تھا جو حیرت سے اسے سے دیکھ رہا تھا۔"(۳۳)

## احتجاج

مظہر الاسلام اور احمد جاوید دونوں علامتی افسانہ نگار ہیں علامتی انداز میں انسانوں پر ہونے والے مظلوم کے خلاف احتجاج کیا ہے پابندی کے باہر اگرچہ یہ احتجاج بآواز بلند نہیں ہے لیکن کردار اکثر اس الجھن کا شکار رہے ہیں کہ وہ اپنی آواز کو کھو دیتے ہیں اخباروں کا ذکر ہے اور ان میں موجود خبروں پر طنز بھی ہے دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں معاشرے کے بدنما اور کھوکھلے پن کے خلاف شدید احتجاج نظر آتا ہے۔
اس پر ڈاکٹر صفیہ عباد مظہر الاسلام کے بارے میں لکھتی ہیں

"سماج کی اصلاح اور نئے سویرے کی نوید ان کی کہانیوں میں اکثر و بیشتر دکھائی دیتی
ہے مقصد بآواز بلند نہیں بلکہ کہانی میں گویا سانس لیتا نظر آتا ہے وہ سماجی برائیوں
کے خلاف لکھتا ہے اس کے دکھوں پر لکھتا ہے۔"(۳۴)

سماج میں پھیلی منافقت ہے ریاکاری جھوٹ فریب دھوکہ دھی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں اور ان کے خلاف احتجاج بھی نظر آتا ہے۔ افسانہ پنجرہ کا کردار سماج میں پھیلی زہر آلود برائیوں سے رنگ آ کر شہر ہونا چاہتا تھا اس کا دوست شہر چھوڑنے کی وجوہات عدالت میں بیان کرتا ہے۔

"وہ شہر چھوڑ کر جانا چاہتا تھا اس کا کہنا تھا کہ اس کے برانڈ کے سگریٹ
نہیں ملتے۔ پیار ختم ہو گیا ہے۔ ہسپتال مریضوں سے بھر گئے ہیں۔ اداسی
میں لذت نہیں رہی۔ روشنی کم اور اندھیرا زیادہ ہو گیا ہے بچوں کو اسکول
میں داخلہ نہیں ملتا۔ خوشامد کا زہر شہر کے وجود کو مفلوج کر رہا ہے۔"(۳۵)

مظہر الاسلام معاشرے کے منفی رویوں کے خلاف لکھتے ہیں وہ سچائی اور ایمانداری کے قائل ہیں۔ انسان دشمنی قوتوں کی دل کھول کر مخالفت کی ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا افسانے کا کردار ہے جو پانچ قتل کرتا ہے دراصل وہ معاشرے کے پانچ منفی رویوں کا قتل کرتا ہے مقتول لالچی بے ایمان اور ضمیر فروش تھے۔ ایک متوازن طبیعت کا مالک ان رویوں سے شدید نفرت کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔ لائن میں ایک شہر کی شکایت کس سے

کرے کا مرکزی کردار بھی معاشرے کے منفی رویوں سے تنگ نظر آتا ہے اور ان کے خلاف احتجاج کرتا دکھائی دیتا ہے۔"شہر کی حالت تسلی بخش نہیں شہر میں منافقت جہالت اور خوشامد فروغ پا رہی ہے۔"اسی طرح افسانہ پاگل کا مرکزی کردار بھی ان برائیوں کے خلاف احتجاج کرتا ہے خود کو ایک بے زبان جانور قرار دیتا ہے ۔اس کی ماں پاگل خانے کے انچارج کو بتاتی ہے

> "چند ماہ پہلے ایک دن صبح صبح وہ اخبار پڑھ رہا تھا کہ یک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا اماں اب میں تھک گیا ہوں۔ مجھ سے شہر کی حالت دیکھی نہیں جاتی ہے میرا دم گھٹ رہا ہے۔ شہر میں جہالت اور محرومی پھیل رہی ہے۔"(۳۶)

شہر پناہ میں آمرانہ نظام کے خلاف احتجاج ہے جس کا کردار کھوئے ہوے شہر کی تلاش میں نظر آتا ہے اور اپنے شہر کی خوبیاں گنواتا ہے۔

> "کیا تمہارے شہر میں چور نہیں تھے ؟میں نے تمہیں بتایا! کہ میرے شہر میں پولیس کم تھی۔ تمہارے شہر میں کون سا نظام تھا؟ محبت، دوستی، درگزر بھائی چارے اور نیکی کا نظام، طاقت سے دوسروں کو زیر نہ کرنے کا نظام ایک دوسرے کی رائے سننے اور اسے اہمیت دینے کا نظام اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ نہ اٹھانے کا نظام میرے شہر میں اقتدار کی بھوک نہیں تھی خوف نہیں تھا رعب، دھونس اور دھاندلی نہیں تھی۔"(۳۷)

افسانہ انا اللہ و انا الیہ راجعون، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی بھی احتجاج کی مثالیں ہیں طاقتور طبقے کا کمزوروں کا استحصال کو علامتی انداز میں احتجاج کیا ہے اس کے علاوہ افسانہ نگاروں کے ہاں علامات کے استعمال میں بھی مماثلت پائی جاتی ہے۔ مظہر الاسلام کا افسانہ سانپ گھر میں مرکزی کردار کو ہر جگہ سانپ دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح احمد جاوید کا افسانہ سانپ ہے جس میں سماج میں پھیلی انسان دشمنی کو چوٹ کیا ہے دونوں افسانہ نگاروں نے منافقت اور جھوٹ کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ مظہر الاسلام کا افسانہ کندھے پر کبوتر اور احمد جاوید کا افسانہ بھیڑیے انسانی رویے کی بدلتی اشکال اور بہیمانہ رویے کے عکاس ہیں۔ اظہار آزادی رائے پر پابندی اور جبر و استحصال کی وجہ سے پھیلی گھٹن دونوں مصنفوں کے ہاں نظر آتی ہے۔ مظہر الاسلام اور احمد

جاوید گمشدہ شہر کی تلاش میں کھوئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مظہر الاسلام کا افسانہ شہر پناہ اور احمد جاوید کا افسانہ گم شدہ شہر کی داستان میں کھوئے ہوئے شہر کی تلاش ہے۔

## مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے افسانوں میں افتراقات

مغربی وجودیت اردو ادب میں آنے والی دیگر تحریکوں کی طرح جودیت کا تعلق بھی مغرب سے ہے لیکن مشرق میں اس کی اصل صورتحال کے ساتھ اس کو نہیں اپنایا گیا چونکہ اس کے کچھ نکات ہمارے مذہب کے منافی تھے۔ خدا سے انکار کو مشرق میں نہیں مانا گیا لیکن اس تحریک کی بدلی ہوئی شکل ہمارے ادب میں ضرور موجود ہے۔ عرفان ذات، مغائرت، خود غرضی، کرب، مایوسی، اداسی جیسے عناصر اردو ادب میں بھی موجود ہے۔ مغرب میں یہ ایک مایوسی کا رویہ تھا فرد اپنی ذاتی الجھنوں سے تنگ آ کر راہِ فرار اختیار کر لینا زیادہ مناسب سمجھتا تھا۔ ہمارے مذہب میں خودکشی کو حرام قرار دیا گیا ہے لیکن ادیب اس جرم کا مرتکب بھی ہوئے ہیں اس کے پس پردہ ایسے محرکات تھے جن سے ان کو زندگی میں کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔
مظہر الاسلام کے افسانے کا وجودیت کے تناظر میں جائزہ لینے کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ مغربی وجودیت کے زیادہ قریب دکھائی دیتے ہیں مایوسی تنہائی اور اداسی کی فضا سے ان کے کردار لذت محسوس کرتے ہیں اور خودکشی کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ خودکشی یمظہر الاسلام کا محبوب ترین موضوع ہے اکثر کرداروں کی کہانی یا خودکشی سے شروع ہوتی ہے یا اس کا انجام خودکشی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر شام پڑے برتن ٹوٹنے کی آواز، پنجرہ، پاگل، پتلیاور ایسے ہی ہیں بہت سے انسانوں میں میں موت کا عنصر دیکھنے کو ملتا ہے مذکورہ تمام افسانوں میں کردار موت کے ڈسے ہوئے ہیں۔ افسانہ ایک شام میں چڑیا کو چگ لیا میں چڑیا کہانی انجام دینے کے لیے مظہر الاسلام کا انتخاب کرتی ہے ہے چڑیا کہانی نویسی سے یوں مخاطب ہوتی ہے

> ” چڑیا بولی ہاں مجھے معلوم ہے تمہارے نزدیک یہ کوئی کہانی نہیں کیونکہ تمہیں احساس نہیں ہے کہ یہ کیا کہانی ہے۔ تم ہمیشہ المناک کہانیاں لکھتے ہو، اداس کہانیاں، تمہاری کہانیوں کی آنکھوں میں آنسو نہ ہوں تو تمہیں مزہ ہی نہیں آتا تم اذیت پسند ہو تمہاری ہر کہانی میں موت خوبصورت محبوبہ کی طرح بال کھولے بیٹھی رہتی ہیں تمہیں موت سے پیار ہے تم اپنی خودکشی کے لئے راہ ہموار کرتے ہو“(۳۸)

مظہر الاسلام کی فکر مغربی وجودی مفکر کافکا سے متاثر نظر آتے ہیں جس کا ذکر مذکورہ والا افسانے میں چڑیا کی زبانی ہوتا ہے

> "چڑیا بولی سب سے پہلے میرے ذہن میں کافکا خیال آیا تھا مگر جب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ کافکا کا ذکر سن کر کر میں کچھ دیر کے لیے احتراماً چپ ہو گیا اور پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا پیاری چڑیا اب تم امرتا پریتم کے پاس جاؤ یہ کہانی بہت بڑی ہے ہے اسے وہی سنبھال سکتی ہے۔"(۳۹)

مظہر الاسلام کی کہانیوں کے کردار تنہائی سے محظوظ ہونے لگتے ہیں وہ اداس اور تنہائی پسند ہو گئے ہیں یہ عنصر مغربی وجودیت میں زیادہ غالب ہے کیونکہ مشرق میں اداسی کو گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ مکمل طور پر مغربی وجودیت کا نام تو نہیں دیا جا سکتا لیکن قنوطی عناصر کی کثرت اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ اس کے برعکس احمد جاوید کے ہاں موت کا عنصر غالب نہیں نظر آتا اور نہ ہی اس نسبت سے تنہائی یا اداسی ان کے کرداروں میں نظر آتی ہے چند ایک افسانوں میں موت کا ذکر اور خودکشی جیسے عناصر ضرور موجود ہیں تاہم اس کی موجودگی بکثرت نہیں ہے۔ آوارہ کتے کی موت، اور پھر خودکشی، اس قسم کے افسانوں کی مثال ہیں۔

امید

مظہر الاسلام کے زیادہ تر افسانوں میں یاسیت کی فضا چھائی رہتی ہے وہ اپنی زندگی اور معاشرے سے ناامید نظر آتے ہیں اس کی وجہ خارجی حالات ہیں جو بیماری کا شکار ہیں۔ بم دھماکے اور ان سے ہونے والے انسانی جانوں کا زیاں انسانوں کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک ریاکاری، دھوکہ بازی نے مظہر الاسلام کو اکتاہٹ کا شکار کر دیا یہی وہ بنیادی وجہ ہے جس کے باعث اس ان کے کردار اپنی زندگی ابھی سے راہِ فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ زندگی اور وجود کو ایک پھندے میں قید تصور کرتے ہیں جس سے رہائی کے لیے وہ خودکشی کا راستہ چن لیتے ہیں۔ جبکہ احمد جاوید کے ہاں امید کا عنصر غالب نظر آتا ہے جو کہ مشرقی وجودیت کا بنیادی عنصر قرار دیا جا سکتا ہے۔ احمد جاوید کی کہانیوں کے کردار یقین دلاتے ہیں اور اور امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اگرچہ ملک بدامنی کا شکار تھا لیکن احمد جاوید وقت کے بدلنے کی کی نوید سناتے دکھائی دیتے ہیں اور اس بات کی یقین دہانی کراتے ہیں کہ براوقت ایک نہ ایک دن گزر جائے گا اچھے دنوں کی امید رکھنی چاہیے۔ وہ ملک میں امن چاہتے ہیں اور اس کے لیے پرامید بھی نظر آتے ہیں۔ وہ حبس کے موسم کا بار بار ذکر کرتے ہیں اس کے

ختم ہونے کی نوید بھی سناتے ہیں اور خوشگوار موسم کے لئے منتظر ہیں انہیں اس بات کا یقین ہے کہ وقت اور حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے بلکہ انہیں موسم کی طرح بدلنا ہوتا ہے۔ افسانہ آثار میں نئے موسم کی نوید سناتے ہیں۔ ”میں سنتا ہوں کہ گلیوں میں نو عمر بچوں نے گلی میں اودھم مچا رکھا ہے کہ انہیں جھکے آتے بادلوں سے بارش کی امید ہے۔“(۴۰) احمد جاوید کو اس بات کا مکمل یقین ہے کہ اس وقت نے بدلنا ہے اور ملک میں پر امن حالات ضرور آئیں گے۔

> ”گویا موسم کے بدلنے کا یقین ہوتا جاتا ہے بلا آخر ایسا ہونا تھا موسم کو
> تو بدلنا ہی ہوتا ہے مگر جب کوئی رت طول پکڑ جائے تو بس یونہی بے
> یقینی سی ہونے لگتی ہے۔“(۴۱)

اسی افسانے کے آخر میں امید دلاتے ہیں کہ وقت اور حالات بدل جاتے ہیں اور ان کے آثار نمایاں ہیں یوں تو پورے افسانے میں اچھے وقت کے آنے کی امید دلاتے ہیں لیکن آخر میں یوں مخاطب ہیں: ”امید رکھنا چاہیے کہ موسم بدلے گا کچھ آثار بھی ہیں۔“(۴۲) افسانہ گشت پر نکلا ہوا سپاہی میں بھی ناامید ہونے والوں کو یہی تلقین کرتے ہیں۔ ”دیکھتے رہنا چاہیے کیا معلوم منظر کب بدل جائے۔“(۴۳) افسانہ دم دار ستارے میں احمد جاوید اچھے وقت کے انتظار کرنے اور برے وقت کے کے گزر جانے کا تذکرہ موسم کی طرح کرتے ہیں ؛”موسم سدا ایک سا نہیں رہتا۔“(۴۴) احمد جاوید حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لیے بھی تیار ہیں اور امید کی ڈور سے بندھے نظر آتے ہیں لکھتے ہیں ہیں ”گلے کی کوئی بات نہیں نہیں مگر ایک امید ہے کہ ہمارے اختیار میں نہیں امید کب ٹوٹتی ہے امید تو سانس کی ڈور ہے“(۴۵) احمد جاوید کے نزدیک انسان امید کے سہارے ہی زندہ رہ سکتا ہے جس طرح انسان کو زندہ رہنے کے لیے سانس کی ضرورت ہوتی ہے بالکل اسی طرح اچھا وقت بدلنے کے لیے امید کا ہونا ضروری ہے۔ قنوطیت زدہ کا ماحول سے باہر نکلنے کے لیے امید ہی واحد وہ سہارا تھا جو ان خارجی حالات سے لڑ سکے اور اسی کے سہارے دن گزارے جائیں۔ احمد جاوید نے خارجی حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے کرداروں کو تیار کیا ہے اور اشرف المخلوقات ہونے پر فخر محسوس کیا ہے۔ اگرچہ معاشرے کے منفی رویوں پر بھی کڑی تنقید کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اچھے وقت کے انتظار کرنے کا بھی پیغام دیتے ہیں۔ معاشرے میں برائیوں کو ختم کرنے اور مثبت رجحان پیدا کرنے کا ذریعہ امید ہے جس کا

سہارا لے کر احمد جاوید نے حالات کے مارے ہوئے لوگوں کو زندہ رہنے اور پر امن ماحول کے لیے رہنے کا درس دیا۔

## سائنسی تشکیک

احمد جاوید کے ہاں سائنسی تشکیک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ بعض وجودی مفکرین سائنسی ترقی کو وجودیت کا نقطہ آغاز بھی سمجھتے ہیں۔ سائنس نے انسان کو سہولیات فراہم کرنے ساتھ ساتھ انسان کو قریبی رشتوں سے دور کر دیا۔ انسان مشینوں کا غلام بن کر رہ گیا وہ مصروف زندگی بسر کرنے لگا اس کے پاس اپنوں کے پاس جانے کے لیے وقت نہ رہا اس کے ساتھ ہی ایٹمی ایجادات بھی سائنس کی عطا کردہ ہیں۔ جن کا استعمال جنگوں میں کیا جانے لگا اس طرح انسان، انسانوں کی زندگیوں کا خاتمہ کرنے لگا۔ انسان کی زندگی سائنس نے سہل تو کر دی لیکن اس کی اپنی انفرادیت کھوگئی۔ احمد جاوید کے مطابق سائنس نے خاطر خواہ ترقی کی ہے انسانوں، جانوروں اور پودوں کی عمروں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن انسان کے جذبات تاحال نہ دریافت ہو سکے۔ سینکروں کی تعداد میں جنگوں میں مارے جانے والے افراد کی شناخت نہ ہو سکی۔ نہ سائنس ان کے بارے میں بتا سکتی ہے کہ وہ کن خواہشات کو لے کر اس دنیا میں زندگی گزار رہے تھے۔ جنگوں میں استعمال ہونے والے ایٹمی بم اور ہتھیاروں کو تاریخی بنا دیا جاتا ہے لیکن جو لوگ اس ہنگامے میں لقمہ اجل بن گئے ان کو آج تک نہ دریافت کیا جا سکا۔ انسان، دوسرے انسان کا قتل کر کے ان ہتھیاروں کو عجائب گھروں میں سجایا لیکن اس بات کا نہ اندازہ کر سکا کہ کتنی قیمتی جانوں کا ضیاع ہوا۔ افسانہ پیادے میں احمد جاوید یوں رقمطراز ہیں

> ” میدان جنگ میں پانی کی پکار، میتوں پر سہاگنوں کے بین اور محفل یار کے رتجگے دربار شاہی کے حکم نامے بھی دریافت ہو جاتے ہیں مگر سزا یافتہ مجرموں کی شناخت نہیں ہوتی۔ ہر چند کے ہڈیوں کے ڈھانچے بھی مل جاتے ہیں۔ مگر کس کام کے نہ بول سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں۔“(۴۶)

احمد جاوید کے ہاں دنیا کے ہنگامے کا ذکر جابجا ملتا ہے۔ وہ صنعتی ترقی کی وجہ سے ہونے والی مصروفیت کا تذکرہ بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں گاڑیوں کا شور اور افراتفری کا عالم لیکن کہیں بھی آدمی دکھائی نہیں دیتے افسانہ گدھ میں آدمیوں کی تلاش میں نظر آتے ہیں۔ اس دنیا کو آدمیوں سے بھرا ہوا جنگل تصور کرتے ہیں جہاں وہ صرف درختوں کی مانند زندگی گزار رہے ہیں ان کا اپنا کوئی مقام نہیں ہے۔

"چہار سمت ترشے ہوئے باغ باغیچے اور رنگ برنگے پھول، سر بفلک عمارتیں اور ان کی آرائشی محرابیں، کشادہ دورویہ سڑکیں۔ پانی اچھالتے خوبصورت فوارے اور ان کے گرد رنگ برنگی جلتی بجھتی روشنیاں۔ موٹریں بسیں، سائیکلیں ٹریفک کا اژدھام اور کارخانوں کی چمنیوں سے نکلتا دھواں اس سے آگے بے ڈھب مکانوں کی بے ڈھنگی قطاریں۔"(۴۷)

احمد جاوید دنیا کے اس ہجوم میں آدمی کی تلاش میں صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے لوگ اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ لیکن کہیں بھی ان کو آدمی نظر نہیں آتے وہ لکھتے ہیں

"کہوں تو کس سے کہوں کہ سارے آثار آبادیوں والے مگر عجب شہر ہے کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہو آیا ہوں آدم نہ آدم کی ذات۔"(۴۸)

ہجوم ہے آوازوں کا شور ہے لیکن کہیں میں آدمی نظر نہیں آتے مجھے دراصل احمد جاوید صنعتی ترقی پر طنز کرتے ہیں کہ جس نے انسان کو اس قدر مشغول کر دیا کہ وہ اپنی ذات تک محدود زندگی گزارنے لگا دوست احباب کی شناخت کھو گیا اپنی زندگی کو سنوارنے اور مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جانے سے گریز نہ کرتا تھا۔ اسی دھن نے انسان کے اندر لالچ، ہوس اور خود غرضی جیسے مہلک برائیوں کو پروان چڑھایا۔

**داخلیت**

مظہر الاسلام اور احمد جاوید دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں داخلیت کا عنصر دیکھنے کو ملتا ہے لیکن احمد جاوید کے ہاں اس عنصر میں زیادہ تسلسل پایا گیا ہے۔ مظہر الاسلام افسانوں میں بھی داخل کی طرف رجوع کرنے اور عرفان ذات حاصل کرنے کی طرف راغب کرتے ہیں مثلاً ان کے افسانے می رقصم، کہانی سے باہر گرا ہوا بابا غیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار مزاروں پر مست دکھائی دیتے ہیں اور اپنے اعمال کو صاف کرنے کے عمل میں کوشاں رہتے ہیں وہ اس دنیا کے ہنگاموں میں سے تنگ آ کر اپنی ذات کی تلاش کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ کہانی سے باہر گرا ہوا بابا کا کردار نوجوان اپنے ہمسفر بابا سے کہتا ہے "بابا میں تنہائی کی بھوک کاٹتا ہوں لمبی بھوک۔ بولا یہ اچھی بات ہے تنہائی کی بھوک کے بعد جب کوئی ملتا ہے تو بس کچھ نہ پوچھو۔"(۴۹) مظہر الاسلام

نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس اذیت کے بعد ہی انسان کو سکون میسر ہوتا ہے انسان کو عرفان ذات حاصل کرنے کے لئے کئی طرح کی مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں تب جا کر اسے سے ذاتی الٰہی کا قرب حاصل ہوتا ہے۔اس کے برعکس احمد جاوید کے ہاں ہاں داخلیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانوں میں کردار اپنی ذات کی تلاش میں گم ہیں۔ میں کون ہوں، میں کون کی صدائیں بلند ہوتی دکھائی دیتی ہیں اور کبھی داخل کو ایک بند کمرے کی مانند سمجھا جاتا ہے جہاں باہر سے یہ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ تو زنگ آلود تالے کے حصار میں ہے۔ لیکن اندر جانے سے ہی یہ انکشاف کھلتا ہے کہ جیسا باہر سے ہو کر سوچا جارہا تھا ویسا اندر نہیں ہے۔اندر کا ماحول پرسکون محسوس ہوتا ہے۔احمد جاوید کے ہاں خدا خود شناسی کا عنصر مظہر الاسلام کی نسبت کثرت سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ احمد جاوید افسانہ آسیب زدہ رات میں لکھتے ہیں

> ” آدمی یوں ہی اندر کو نہیں جھک جاتا آتا جب فکر اور اندیشہ خواب اور خیال زور
> کرتے ہیں۔جب بارشیں مسلسل برستیں ہیں۔اولے پڑتے ہیں طوفان اٹھتے ہیں
> چھت کڑکڑاتا ہے۔دیواریں ہلتی ہیں۔پلستر اکھڑتا ہے۔آدمی بیٹھنے لگتا ہے۔“ (۵۰)

آکاس بیل کے کردار کو اس کا ضمیر جنجھوڑتا ہے کہ اس نیند سے جاگ جاؤ وہ ضمیر کی مسلسل دستک پر حیران ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ کیا میرے اندر ہے یا باہر؟ اس کے اندر ایک عجیب صورتحال گتھم گتھا ہے وہ کہتا ہے ”ذرا نقشہ لاؤ۔ کہاں لڑائی ہو رہی ہے۔؟ کون لڑ رہا ہے؟ باہر یا اندر، اندر یا باہر۔ یہ میرے اندر کون لڑ رہا ہے؟“ (۵۱) مذکورہ بالا افسانے کا کردار اپنے اندر اور باہر کے درمیان ایک عجیب کشمکش اور تذبذب کے عالم میں زندگی گزار رہا ہے۔”کبھی اندر سے کوئی کوئی دستک کرتا ہے جیسے باہر آنا چاہتا ہے کبھی باہر سے دستک ہوتی ہے جیسے کوئی باہر بلاتا ہوں“ (۵۲) کہانی کی گرہ، کا مرکزی کردار بھی ہجوم سے الگ ہو کر اپنی دنیا کی راہ لیتا ہے وہ تنہائی کے سفر پر گامزن ہے جہاں وہ خود کی تلاش میں ہے وہ گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتا ہے

> ”آہ وہ خواب سے دن جب اس نے مجھے موسموں کے سپرد کیا اور پرندوں کے اور
> کہا کہ خود کو ان میں تلاش کر لیا کرو پالئے جاؤ گے۔ ہجوم میں نکلو گے تو کھو
> جاؤ گے۔ تو میں نے خود کو دوسروں سے جدا کر لیا۔“ (۵۳)

بیمار کی رات کا کردار بھی آپ نے داخل کی طرف رجوع کرنے سے پہلے گمان کرتا ہے کہ وہاں تو زنگ آلود تالا لگا ہے ہے جو کہ اجاڑ پن کی علامت ہے لیکن جب وہ اس میں داخل ہوتا ہے تو خود کو پر سکون محسوس کرتا ہے احمد جاوید کے افسانے خود آگاہی کے حوالے سے اس لحاظ سے بھی متفرق نظر آتے ہیں کہ وہ اپنے من کے اندر داخل ہونے کے بعد کی صورتحال کرتے ہیں ہیں مذکورہ افسانے کا کردار جب اپنے اندر داخل ہوتا ہے ہے تو کچھ اس طرح محسوس کرتا ہے

> " تو اس نے گھبرا کے نعرہ مستانہ بلند کیا اور گریبان چاک کر لیا۔ دامن تار تار ہوا
> تو حیرت ہوئی کے دروازے کے پٹ وا تھے۔ بھید افشاء تھے۔ تو اپنے گریبان چاک
> کرنے اور اس گھر میں داخل ہونے سے پہلے جو سوچا وہ گمان تھا۔"(۵۴)

احمد جاوید نے داخل کی دنیا میں جو سکون ہے اس کو بیان کیا ہے۔ دنیا کی گہما گہمی ی سے دور وہ اکیلے اپنے من کے اندر رہنے کی جستجو میں رہتے ہیں جہاں وہ اپنے غموں کا مداوا کرتے ہیں۔ احمد جاوید کے افسانے اپنے عہد کے سیاسی وسماجی صورتحال کے غماز ہونے کے ساتھ ساتھ امید اور داخلی کیفیات سے سرشار نظر آتے ہیں۔
مظہر الاسلام اور احمد جاوید دونوں ہم عصر افسانہ نگار ہیں دونوں کی افسانہ نگاری تقریباً ۷۰ء کی دہائی میں زیادہ واضح نظر آتی ہے اگر چہ آغاز ۶۰ء کی دہائی میں کیا۔ دونوں کے ہاں وجودیت کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں کیونکہان کا تعلق پاکستان سے ہے لہذا خارجی حالات نے بھی دونوں کو شدت سے متاثر کیا۔ دونوں افسانہ نگاروں کے منتخب افسانوں کا تقابل وجودیت کے تناظر میں کیا گیا ہے مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے ہاں رجائی اور قنوطی وجودی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے اپنی ذات کی گمشدگی کا احساس دونوں کے ہاں موجود ہے اگرچہ بیان میں فرق ہے مظہر الاسلام کے کردار اپنی ذات کی تلاش میں نظر آتے ہیں وہ تنہائی کی پر خار راہوں اور کڑی آزمائیشوں سے گزر کر سکون کی طلب چاہتے ہیں خود شناسی کا عنصر کے افسانوں میں موجود ضرور ہے لیکن احمد جاوید کے ہاں تسلسل کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے احمد جاوید کے افسانوں کے کردار کے معنی زندگی پر سوال کرتے ہیں اور اپنی تلاش میں ہیں۔
اپنی داخل کی آوازوں کو سنتے ہیں اور اجاڑ من کے اندر داخل ہونے کی طلب رکھتے ہیں دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں فرق اس بات میں معلوم ہوا ہے کہ احمد جاوید کے کردار جب اپنی طلب کو پا لیتے ہیں تو اس کے بعد کی کیفیات کو بھی تحریر کرتے ہیں۔ وہ سکون اور پر امن ماحول بھی دکھاتے ہیں جو ان کڑی آزمائشوں کے بعد

حاصل ہوتا ہے اس کے برعکس مظہر الاسلام کے افسانے میں طلب ضرور ہے لیکن حاصل کے بعد کی صورت حال کو بیان نہیں کیا گیا ہے۔ دونوں کے ہاں احتجاج بھی موجود ہے وہ خارجی صورتحال کے خلاف بھی ہے آزادی کی خاطر، اعلیٰ طبقے کے ظلم وستم کے خلاف اور ملکی سیاسی صورتحال کے خلاف دونوں افسانہ نگاروں نے شدید تنقید کی ہے۔ دونوں افسانہ نگار اپنے کھوئے ہوئے شہر کی تلاش میں ہیں وہ پر امن ماحول کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں ہیں ایسے شہر کی تلاش میں ہیں جہاں وہ رہتا کر سکون کی زندگی گزار سکیں۔ علاوہ ازیں دونوں افسانہ نگاروں میں معاشرے میں پھیلی بدعنوانیوں کو موضوع بنایا ہے جھوٹ اور مکر وفریب جو کے معاشرے کی رگوں میں سرایت کر چکا تھا پر شدید کڑھتے ہیں خوف کی فضا بھی دونوں کے ہاں موجود ہے وہ خارجی حالات کے باعث پھیلی گھٹن اور وحشت کو موضوع بناتے ہیں مظہر الاسلام کے کردار آزادی اظہار پر پابندی کے باعث آواز کے گم ہونے پر اس کی تلاش میں ہیں اسی طرح احمد جاوید کے ہاں بھی آواز کے گم ہونے پر شدید پریشانی کا اظہار ہے۔

مارشل لا کے باعث لگائی جانے والی پابندیوں، پولیس کے ظلم اور جنگوں میں بے گناہ مارے جانے والے لوگوں کے دکھوں کو بیان کیا ہے۔ اور ہجوم سے بھاگنا چاہتے ہیں لوگوں کی بھیڑ میں خود سے خوف محسوس کرتے ہیں ان کے اندر وجود کا کرب موجود ہے کردار خود کو ایک قیدی تصور کرتے ہیں ۔ احمد جاوید اس پر یوں طنز کرتے ہیں کے انسان زمین اور آسمان کے درمیان پنجرے میں مقید ہے انسان کی آزادی کی طلب دونوں کے ہاں موجود ہے۔ مندرجہ بالا مماثل عناصر کے باوجود چند عناصر میں اختلاف بھی نظر آتا ہے۔ مغربی وجودیت کے زیادہ اثرات مظہر الاسلام کے افسانے میں نظر آتے ہیں اگرچہ ان کے افسانوں کو مکمل طور پر مغربی وجودیت کے زیر اثر نہیں کہا جا سکتا۔ احمد جاوید کے افسانے مشرقی وجودیت کے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں ان کے ہاں امید کا عنصر اور خود شناسی کے عناصر غالب نظر آتے ہیں وہ یقین دلاتے ہیں کہ ایک دن وقت بدل جائے گا اس کے برعکس مظہر الاسلام کے کردار مایوسی و اداسی کو گلے لگا کر خودکشی کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مظہر الاسلام کے افسانے میں قنوطی عناصر کی کثرت ہے اس کے علاوہ احمد جاوید کے ہاں سائنسی ترقی اور صنعتی ترقی پر بھی طنز ملتا ہے۔

# حوالہ جات


۱۔ مظہر الاسلام، کہانی کی مٹھی میں ڈرامہ، گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو، لیو بکس، بلیو ایریا، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۸۷

۲۔ صفیہ عباد، ڈاکٹر، کہانی مظہر الاسلام ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۳۹

۳۔ مظہر الاسلام، پنجرہ، باتوں کی میں بھیگتی لڑکی (افسانوی مجموعہ)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۳۸

۴۔ ایضاً، ص ۳۵

۵۔ ایضاً، ص ۵۴

۶۔ احمد جاوید، دمدار ستارے، غیر علامتی کہانی (افسانوی مجموعہ)، خالدین، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۲۹۰

۷۔ رشید امجد، ڈاکٹر، احتجاج کا نیا موسم، مطبوعہ، انگارے، ملتان، ۲۰۰۶ء، ص ۲۷

۸۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص ۱۱۹

۹۔ ایضاً، ص ۳۰۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۱۔ صفیہ عباد، ڈاکٹر، کہانی مظہر الاسلام ہے، ص ۵۰

۱۲۔ مظہر الاسلام، گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو، ص ۹۸

۱۳۔ مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی، ص ۸۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۴

۱۵۔ احمد جاوید، چڑیا گھر، ص ۱۵۲

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۱۸۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، ص ۲۴۸

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۵۱

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۵۷

۲۱۔ مظہر الاسلام، گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو، ص ۵۹

۲۲۔ مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی (افسانوی مجموعہ)، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۳۴

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۳۳

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۴

۲۵۔ مظہر الاسلام، گڑیا کی آنکھ سے شہر کو دیکھو، ص ۱۳

۲۶۔ پروفیسر فتح ملک، مظہر الاسلام کی افسانہ نگاری مشمولہ، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی، ص ۱۸۱

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۵

۲۸۔ احمد جاوید، چڑیا گھر، ص ۱۷۷

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۷۷

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۳۱۔ ایضاً،، ص ۱۶۴

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۶۸

۳۳۔ احمد جاوید، گمشدہ شہر، ص ۴۱۰

۳۴۔ صفیہ عباد، ڈاکٹر، کہانی مظہر الاسلام ہے، ص ۶۰

۳۵۔ مظہر الاسلام، باتوں کی میں بھیگتی لڑکی، ص ۳۴

۳۶۔ ایضاً، ص ۸۰

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۳۸۔ ایضاً، ص ۶۶

۳۹۔ ایضاً، ص ۶۶

۴۰۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، ص ۲۵۸

۴۱۔ ایضاً، ص ۲۵۹

۴۲۔ ایضاً، ص ۲۶۱

۴۳۔ ایضاً، ص ۲۶۶

۴۴۔ ایضاً، ص ۲۸۶

۴۵۔ ایضاً، ص ۲۹۲

۴۶۔ ایضاً، ص ۲۷۸

۴۷۔ احمد جاوید، گمشدہ شہر، ص ۳۷۲

۴۸۔ ایضاً، ص ۳۷۲

۴۹۔ مظہر الاسلام، باتوں کی میں بھیگتی لڑکی، ص ۱۱۹

۵۰۔ احمد جاوید، غیر علامتی کہانی، ص۲۴۹

۵۱۔ ایضاً، ص۲۹۶

۵۲۔ ایضاً، ص۲۹۷

۵۳۔ ایضاً، ص۳۰۵

۵۴۔ ایضاً، ص۳۲۵

باب پنجم

# مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج، سفارشات

## الف: مجموعی جائزہ

وجودیت ۲۰ءصدی کی نمایاں تحریکوں میں سے ایک تحریک ہے اس تحریک نے جنگ عظیم اول اور دوم کے بعد زور پکڑا وجودیت کا تعلق فرد کے وجود سے ہے انیس ناگی وجودیت کو بیسویں صدی کی ادب کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والی تحریک کہا ہے اردو ادب میں آنے والی تحریکوں کا تعلق مغرب سے ہے وجودیت کی تحریک بھی مغرب میں ظہور پذیر ہوئی وجودیت کی تحریک مطلیقت پسندی اور عقلیت پسندی کو رد کرتی ہے ہیگل نے انسان کو اس دنیا کا ایک چھوٹا سا پزرہ قرار دیا اسکے مطابق اس دنیا میں انسان کی حیثیت ایک چھوٹے سے پزرے کی مانند ہے۔ کرکیگارڈ نے سب سے پہلے ہیگل کے اس نظریے کے خلاف آواز بلند کی۔ اس کا کہنا ہے کہ جب میں سوچتا ہوں کہ میں ایک عظیم الشان دنیا کا پرزہ ہوں تو میں لرز اٹھتا ہوں کرکیگارڈ کے نظریات کو اس کی زندگی میں پذیرائی نہ مل سکی لیکن اُس کی وفات کے بعد اس کے افکار کو فروغ ملا۔ کرکیگارڈ مذہبی وجودی مفکر تھا لہٰذا اس نے انسان کے مسائل کا حل اس کے باطن کو جانا اور کہا کہ فرد اپنا تشخص دوبارہ قائم کر سکتا ہے اگر وہ باطن کی طرف رجوع کرئے۔ کرکیگارڈ کی وفات کے بعد اس کے شاگرد جبرئیل مارسل نے ان افکار کو یکجا کر کے پیش کیا۔ اس نے سائنسی اور مشینی ترقی کے خلاف آواز بلند کی جنھوں نے انسان کو تنہا کر دیا تھا اس کے خیال میں سائنس انسانی معروضیات کا مطالوہ تو کرتی ہے لیکن وجود تک رسائی حاصل نہیں کر سکی۔ وجودیت کے دو گروہ ہیں ایک الٰہیاتی اور دوسرا غیر الٰہیاتی۔ الٰہیاتی وجودی مفکرین سورین کرکیگارڈ کو اپنا راہنما تسلیم کرتا ہے۔ ان میں مارٹن، جبرئیل مارسل کا نام قابل ذکر ہے جبکہ غیر الٰہیاتی وجودی مفکرین میں سارتر کا نام نمایاں ہے۔ سارتر کے مطابق یہ دنیا لغو ہے اس میں زندگی گزارنے کے کوئی اصول وضوابط مقرر نہیں ہیں نہ یہ دنیا ہمیں واضح اور متعین اصول فراہم کرتی ہے۔ اس لیے اس دنیا کو جو شکل ہم دیں گے وہی اختیار کرئے گی اس کا ماننا ہے کی انسانی فطرت نام کی کوئی چیز نہیں اور نہ کوئی اخلاقی ضوابط موجود ہیں جن کی پیروی کر کے ہم زندگی گزاریں۔ سارتر کے لیے یہ دنیا مہمل ہے اس میں انسان کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے لیے سب سے مشکل اس کی آزادی ہے۔ انسان اپنے لیے خود راستے کا انتخاب کرتا ہے جب

وہ کسی ایک راستے کہ چھوڑتا ہے اور دوسرے کا انتخاب کرتا ہے تو وہ کرب میں مبتلا ہوتا ہے۔ انسان کو اگرچہ انتخاب میں آزادی ہے لیکن یہی آزادی اس کی لیے سزا بھی ہے کیونکہ کسی ایک فرد کا عمل تمام انسانیت کے لے ہوتا ہے یہ انسان پر بھاری ذمہ داری عائد ہے۔ سارتر کے مطابق انسان وہی کچھ بنتا ہے جو وہ خود کو بنانا چاہتا ہے پہلے سے کوئی جوہر موجود نہیں ہے وہ خدا سے انکار کرتا ہے۔ سارتر کے خیال میں انسان کو وہ عمل طاقتور بناتا ہے جو کہ امید کے بغیر سرانجام دیا گیا ہو اس لیے وہ ناامیدی، مایوسی اور بے بسی کو انسان کے لیے ضروری تصور کرتا ہے۔ ہائیڈیگر بھی غیر مذہبی وجودی مفکر ہے اس کا کہنا ہے کہ انسان کو بے بس اور مجبور کر دینے والا امر موت ہے موت زندگی کی متضاد ہے اور زندگی کے بے مقصد کو ناکارہ بناتی ہے اسکے خیال میں موت کا خوف انسان کو بے چارگی کا احساس دلاتا ہے۔ یہ زندگی اور اس کے تمام مقاصد کو بڑی آسانی کے ساتھ ختم کر دیتی ہے وہ زندگی کے بعد موت کے آنے پر احتجاج کرتا ہے۔ البرٹ کامیو دنیا کو لغو قرار دیتا ہے اس کے مطابق دنیا میں کوئی مقصدیت نہیں ہے اور انسان کو اسکی مرضی کے خلاف اس دنیا میں پھینکا گیا ہے۔

کافکا داخلیت پر زور دیتا ہے اس کے مطابق انسان اپنے وجود کو مصدق داخلی دنیا سے عبارت کر کے کر سکتا ہے مذہبی اور غیر مذہبی وجودیت دونوں فرد کی انفرادیت پر زور دیتی ہیں ان کے مطابق فرد گروہ یا اجتماع میں اپنی انفردی حیثیت کھو دیتا ہے اگرچہ ان مفکرین کے افکار میں اختلاف پایا گیا ہے لیکن مشترک پہلو فرد کی انفرادیت ہے جو سب وجودی مفکرین کے ہاں دیکھنے میں ملتا ہے۔ وہ فرد کی ذاتی حیثیت کھو جانے پر اسے انفرادی زندگی کی طرف مائل کرتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ داخلی یا باطنی دنیا سے انفرادیت کو قائم رکھا جا سکتا ہے۔ ان مفکرین کے ہاں جو عناصر مشترک ہیں ان میں مایوسی، اداسی، بے چارگی، کرب، لایعنیت اور موت ہیں اس تحریک کے اثرات معاشرے کے ہر جزو پر مرتب ہوئے اس نے سیاسی مذہبی، معاشرتی اور نفسیاتی ہر سطح پر گہرے اثرات ثبت کیے۔ ادب بھی اس تحریک سے متاثر ہوا اس تحریک نے مشرق میں اردو ادب کو بھی متاثر کیا کیونکہ یہ تحریک فرد کے مسائل کی آواز بن کر ابھری اس لیے مشرقی ادب نے اس سے اثر قبول کیا اور فرد کے مسائل کو موضوع بنایا جانے لگا مشرق میں اس تحریک کے افکار و نظریات کو ہو بہو قبول نہیں کیا گیا کیونکہ خدا سے انکار ہمارے مذہب کے منافی ہے اس لیے اس تحریک کی اس فکر کو مشرق میں پذیرائی نہ مل سکی۔ داخلیت کا عنصر مشرق میں پہلے سے ہی موجود تھا جو کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے اپنے آپ کو پہچاننا اپنے رب کو پہچاننا یہ تعلیمات ہمارے مذہب میں موجود ہیں اس لیے عرفان ذات کا مشرق میں نیا تصور تو نہ تھا لیکن اس تحریک نے اس کو مزید تقویت بخشی۔ ناامیدی یا مایوسی میں خدائی حقیقت سے روشناس

ہو کر خودی کو قوی ہونے کی طرف توجہ دلائی۔ مغرب میں ناامیدی، مایوسی اور بے بسی جیسے عناصر ملتے ہیں جبکہ مشرق میں مایوسی یا اداسی کو گناہ سمجھا جاتا ہے اس کے برعکس امید کا عنصر مایوسی و اداسی پر غالب نظر آتا ہے۔ مشرق میں بھی اس فلسفے کے حوالے سے نظریات میں اختلاف پایا گیا ہے بعض ناقدین اسے بحران زدہ فرد کے مسائل کا حل جانتے ہیں بعض کے نزدیک یہ ایک مایوسی کا رویہ ہے ڈاکٹر جمیل جالبی اسے بیسویں صدی کے بحران زدہ انسان کو دوبارہ زندگی کی طرف لانے والا رویہ سمجھتے ہیں جبکہ ریاض احمد اس کو مایوسی اور اداسی کا رویہ جانتے ہیں اختلاف آراء کے باوجود ادیبوں نے اس کے زیر اثر ادب تخلیق کیا لیکن یکسر قنوطیت زدہ ادب نہیں ہے اس میں چند رجائی عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مشرقی وجودیت کو مغربی وجودیت سے الگ کرنے والا عنصر امید کا ہے مشرق میں امید کے بغیر عمل نہیں ملتا ہے۔ وجودیت اردو ادب میں ساٹھ کی دہائی میں آئی اس کے اثرات شاعری اور نثری تخلیقات دونوں میں موجود ہیں۔

اردو افسانے میں بھی وجودی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے ساٹھ کی دہائی میں افسانے میں نئے موضوعات کا آغاز ہوا علامتی اور استعاراتی انداز میں افسانے لکھے گئے۔ وجودیت جو کہ فرد کے مسائل سے متعلقہ ہے اس لیے اس دور کے افسانوں میں وجودی عناصر کی کارفرمائی ملتی ہے۔ اس عہد کا انسان دکھوں کا مارا ہوا تھا تقسیم کے بعد کے واقعات، اثاثوں کی تقسیم، ہجرت کا دکھ اور ملکی سیاسی صورتحال نے انسان کو اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا اسے اپنی زندگی سے دلچسپی ختم ہوتی نظر آئی۔ سائنسی و مشینی ترقی نے انسان کے سامنے ہزاروں سوالات کھڑے کر دیے انسان تنہا زندگی گزارنے لگا معاشرہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو گیا ان تمام مسائل کو ادب میں جگہ دی جانے لگی اور روایتی انداز میں ادب تخلیق کرنے کے بجائے نئے اور جدید مسائل کو موضوع بنا کر پیش کیا جانے لگا۔ افسانے میں زندگی کی ان حقیقتوں کو کرداروں کے ذریعے بیان کیا گیا ادیب چونکہ روح عصر کی آواز ہوتا ہے وہ اپنی تخلیق کا مواد معاشرے اور گردوپیش کے ماحول سے لیتا ہے وہ معاشرے کا حساس فرد ہونے کے ناطے ان مسائل کو اپنی تحریروں میں بیان کرتا ہے۔

وجودیت کی تحریک نے سیاسی، معاشی اور مذہبی سطح پر تمام پہلو کو متاثر کیا سارتر نے وجودی فلسفہ کو فروغ دینے کے لیے ادب تخلیق کیا اس کا ماننا ہے کہ اگرچہ ادب زندگی کا آئینہ تو نہیں لیکن اس کے ذریعے وجود کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ادیب کرداروں کے ذریعے اپنے وجود کو تلاش کرتا ہے مظہر الاسلام اور احمد جاوید اسی دور کے افسانہ نگار ہیں جب وجودیت کی تحریک اردو ادب میں داخل ہوئی اس کے اثرات دونوں افسانہ نگاروں کے افسانوں میں موجود ہیں دونوں افسانہ نگاروں نے گردوپیش کے مسائل پر گہری نظر رکھی ہے اور سماج میں

رونما ہونے والے واقعات کو موضوع بنایا ہے اگرچہ اظہار علامتی انداز میں ہے مظہر الاسلام نے علامتی انداز میں اپنے گرد و پیش وُقوع پذیر ہونے والے واقعات کو موضوع بنایا ہے ان کے افسانوں میں وجودی عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مجموعی طور پر مایوسی و تنہائی اور اداسی کی فضا چھائی رہتی ہے بیشتر کردار تنہا زندگی گزار رہے ہوتے ہیں اور تنہائی اداسی کو خمیر میں شامل سمجھتے ہیں مظہر الاسلام کہانی کی تخلیق کو ایک اذیت ناک عمل قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کہانی لکھنا میرے لئے عذاب ہے ایک کہانی مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے خوف کو اس عہد کا استعارہ قرار دیتے ہیں اور خوفزدہ زندگی گزارنے پر طنز بھی کرتے ہیں خوفزدہ زندگی چوہوں کی مانند ہے۔ دراصل اس وقت کے سیاسی پابندیوں کے باعث جو خوف پھیلا تھا اس پر طنز ہے انسان فطرتاً آزاد ہے اور آزادی کا قائل ہے۔

مظہر اسلام نے ان پابندیوں سے آزادی حاصل کرنے کی طرف توجہ دی ان کے خیال میں وجود ایک پنجرہ ہے جس میں انسان قید کی طرح زندگی گزار رہا ہے اور انسان غلامی کو سخت ناپسند کرتا ہے جو کہ طبقاتی کشمکش کا باعث بنی۔ مظہر الاسلام اپنے وجود کو ویران جگہ قرار دیتے ہیں جہاں صرف تنہائی ہے اس تنہائی کے باعث کردار نفسیاتی الجھن کا شکار ہوتے ہیں اور وہ گھٹن محسوس کرتے ہیں۔ انسان اگر آزادی کے لیے آواز نہ بلند کرے تو یہ جذبات اس کے اندر تصادم کا شکار ھو جاتے ہیں اور نتیجے کے طور پر انسان اندرونی طور پر تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے یہی مسائل مظہر الاسلام کے افسانے کے کرداروں میں دیکھنے کو ملتے ہیں ان کے اندر وجودی کرب ہے۔ وہ دنیا اور زندگی کو بے معنی تصور کرتے ہیں اور وجود سے چھٹکارا پانے کے لیے خودکشی کے راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ خودکشی کا عنصر مظہر الاسلام کے افسانوں میں تسلسل کے ساتھ موجود ہے وہ کسی دوسرے کے ہاتھوں مرنے سے خود اپنی موت مرنے کے قائل نظر آتے ہیں۔

مظہر الاسلام کے افسانے میں قنوطی عناصر کی موجودگی کے ساتھ رجائی عناصر بھی دیکھنے کو ملتے ہیں مظہر الاسلام کے کردار خود آگاہی اور خود شناسی کی دعوت بھی دیتے ہیں وہ اپنی ذات کی تلاش میں نظر آتے ہیں اور خدا کی حقیقت سے آشنا ہونے کی طلب رکھتے ہیں وہ مست حال میں اپنے خارجی ماحول کو فراموش کر کے باطن میں داخل ہوتے ہیں اور تنہائی کی کٹھن راہوں کا انتخاب اس لیے کرتے ہیں کہ ان کو پانے کی طلب ہے۔ مظہر الاسلام سلوک کو روح کا عروسی جوڑا قرار دیتے ہیں ان کے کردار اپنی ذات کی تلاش میں مزاروں پر اپنے حال میں مست ہیں وہ شب برات کی بابرکت رات میں اپنے اعمال کو ساتھ کرنے کے عمل میں مصروف ہیں۔ وجودیت سے اجتماع کٹ کر زندگی گزارنے کی طرف لے جاتی ہے کیونکہ اجتماع میں انسان اپنی

شخصیت میں موجود صلاحیتوں کو کھو دیتا ہے۔ مظہر الاسلام تنہائی پسند ہونے کے ساتھ ساتھ اجتماعی احساس بھی رکھتے ہیں وہ معاشرے کے ان بے حس لوگوں میں اپنا شمار نہیں کرتے جن پر بیرونی حالات اثرانداز نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ خود غرضی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں وہ اس بات کر شدید طنز کرتے ہیں کہ معاشرہ خود غرضی جیسے عناصر کی آماجگاہ بن چکا ہے انسان مادیت پرست ہو چکا ہے اور اپنے مفاد کی خاطر کسی حد تک جانے سے گریز نہیں کرتا انسانی حقوق کی پامالی عام سی بات بن گئی تھی۔

مظہر الاسلام نے اجتماعی احساس کو بھی اجاگر کیا اور معاشرے کی اصلاح چاہتے ہیں وہ سماج کو ان برائیوں سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں ایک پرامن ماحول کے متلاشی ہیں جہاں اخوت وبھائی چارے کے ساتھ زندگی بسر کی جا سکے۔ مظہر الاسلام آزادی کے متمنی ہیں اور وہ اپنے کرداروں کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں وطن عزیز کی مٹی سے محبت کا جذبہ رکھتے ہیں اور اس پر دوسروں کی حکمرانی کو پسند نہیں کرتے علاوہ ازیں وہ اپنے کرداروں کو زندگی کے ہر فیصلے اور ہر میدان میں آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ مجموعی طور پر مظہر الاسلام کے افسانوں میں قنوطی عناصر کی بہتات نظر آتی ہے

احمد جاوید نے ستر کی دہائی میں باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز کیا علامتی انداز میں افسانے لکھے گہرا عصری شعور رکھتے ہیں وجودیت نے احمد جاوید کو بھی متاثر کیا ان کی تحریروں میں وجودی عناصر موجود ہیں چھوٹے چھوٹے واقعات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور پھر ان کو اپنے افسانوں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ستر کی دہائی میں ملک میں رونما ہونے والے واقعات نے ہر خاص وعام کے جذبات کو متاثر کیا ملک کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا اور مارشل لاء کا نفاذ جیسے ایسے عوامل ہے جنھوں نے انسانوں کو گہرا صدمہ پہنچایا۔ ملک سیاسی و سماجی طور پر زوال کا شکار تھا اس دور میں احمد جاوید نے فرد کے مسائل کو موضوع بنایا خوف اور گھٹن کی فضا ستر کی دہائی میں لکھے جانے والے افسانوں میں نمایاں ہے۔

حبس کا موسم اور پتنگے، چھپکلیاں ان کے افسانوں کو علامتی انداز میں آگے بڑھاتے ہیں گھٹن زدہ فضا میں وہ زندگی گزارنا مشکل تصور کرتے ہیں کرفیو کی وجہ سے پھیلا خوف اور پولیس کے بے جا مظالم کی وجہ سے پھیلی وحشت پر تنقید کرتے ہیں ہر وقت دشمن کا خوف چین کی زندگی بسر نہیں کرنے دیتا۔ ان کے افسانوں میں وجودی کرب موجود ہے اور آسماں اور زمین کے درمیان موجود ہر چیز کو قید تصور کرتے ہیں ان کے خیال میں پرندے اور آدمی دونوں آزادی کے استعارے ہیں آزادی ان دونوں کی فطرت میں شامل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آدمیوں کو بھی قید کیا جاسکتا ہے قید تو ان درندہ صفت جانوروں کو کیا جاتا ہے جو نقصان پہنچاتے ہیں

لیکن یہ کیسا دور ہے آدمی بھی قید کیے جانے لگے ہیں۔ احمد جاوید کے ہاں دنیا دکھوں کا گھوارہ ہے اس دنیا سے غموں کو نہیں نکالا جاسکتا ہے وہ آدمیوں کو دکھ خیال کرتے ہیں جو کہ ایک مرتا ہے تو دوسرا پیدا ہو جاتا ہے وہ اس دنیا کی بے مقصد زندگی گزارنے پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ احمد جاوید کے افسانوں میں حالات کے خلاف شدید احتجاج بھی ملتا ہے وہ آزاد زندگی گزارنے کے خواہاں ہیں اظہار پر پابندی کے باعث شہر کے تمام لوگوں کی آوازوں کے گم ہونے پر پریشان ہیں طبقاتی استحصال کی وجہ سے معاشی بحران زدہ انسان کو موضوع بنایا ہے۔ معاشرے میں پھیلی خوشامد اور خود غرضی کے سخت مخالف ہیں موت کا عنصر بھی موجود ہے لیکن زیادہ شدت کے ساتھ نہیں ہے۔

اس کے برعکس امید کا عنصر غالب نظر آتا ہے وہ بحران زدہ لوگوں کو وقت کے بدلنے کی امید دلاتے ہیں ان کے خیال میں جس طرح موسم ایک جیسا نہیں رہتا بالکل اسی طرح وقت بھی ایک جیسا نہیں رہتا اس نے ایک نہ ایک دن بدلنا ہے جیسے موسم بدلتا ہے۔ مارشل لا کے باعث لگائی جانے والی پابندیوں کے خلاف احتجاج دیکھنے کو ملتا ہے لیکن ان بے بسی کے حالات میں وہ ناامیدی کی طرف مائل نہیں ہونے دیتے بلکہ اچھے وقت کی امید رکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں امید پر انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے امید ایک بے اختیار چیز ہے اور بے یقینی کو انسان کی عادت خیال کرتے ہیں۔ احمد جاوید کا ماننا ہے کہ جب حالات زیادہ عرصے کے لیے ایک جیسے رہ جائیں تو انسان کے اندر بس یوں ہی بے یقینی سی آجاتی ہے حالانکہ حالات جیسے بھی ہوں انہوں نے بدلنا ہے۔

احمد جاوید اپنے کھوئے ہوئے شہر کی تلاش میں ہیں۔ احمد جاوید کے ہاں داخلیت کا عنصر بھی غالب نظر آتا ہے دنیا کی گہما گہمی سے دور اپنی انفرادیت کو بحال رکھنے کے لیے وہ باطن کا سفر کرتے ہیں ان کے اندر کی آواز، میں کون زیادہ سنائی دیتی ہے۔ وہ باطن کو ایک بند کمرہ بھی سمجھتے ہیں جہاں باہر سے اسے انسان اجاڑپن اور زنگ آلود ہونے کا گمان کرتا ہے۔ وہ داخلی کیفیات کو بام عروج تک پہنچانے کے بعد کی کیفیات کو بیان کرتے ہیں وہ باطنی زندگی کو پرسکون اور ٹھنڈی دکھاتے ہیں۔ جہاں باہر کی دنیا سے سب کچھ بہت مختلف ہے ایک کھلا جہاں ہے جہاں سانس لینے میں کوئی دشواری نہیں اور انسان پُرامن رہتا ہے۔

وجودی مفکرین کا بھی ماننا ہے کہ انسان دنیا کے بحران سے نکلنے کے لئے باطن کا سفر کرے وہی سفر احمد جاوید کے کردار کرتے دکھائی دیتے ہیں ان کے کردار داخلی سفر اور تنہائی میں لذت محسوس کرتے ہیں ایک انوکھا احساس ان کے ہمسفر ہوتا ہے وہ باہر کی آنکھ سے دیکھنے میں محدودیت تصور کرتے ہیں جب کے اندرونی آنکھ

سے زیادہ دیکھا جا سکتا ہے جب کہ خارجی آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ سائنسی اور صنعتی ترقی پر شدید تنقید کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ سائنسی ترقی نے بوسیدہ ہڈیوں سے یہ تو دریافت کر لیا کہ انسان کی عمر کتنی تھی لیکن انسانی جذبات تک رسائی نہ حاصل کر سکی انسانی خواہشات اور جذبات سائنسی ترقی کی دسترس سے باہر رہے۔ سائنس نے بم ایجاد کر لیا لیکن اس کا نقصان انسانی جانوں نے ہی اٹھایا احمد جاوید اس بات پر طنز کرتے ہیں کہ جنگوں میں استعمال کیے جانے والے اوزار عجائب گھروں کی زینت بن گئے لیکن ان جنگوں میں مارے جانے والے انسانوں کا کیا؟ جن کی کوئی شناخت نہیں۔ صنعتی ترقی پر بھی کڑھتے ہیں گاڑیوں کا شور ہے، دھکم پیل ہے، افراتفری کا عالم ہے ہر شخص اپنی زندگی کی آسائشوں کی خاطر بھاگ رہا ہے وہ ان مشینوں کو چلتا دیکھ سکتے ہیں لیکن آدمیوں کی تلاش میں ہیں کہ وہ کہیں بھی نظر نہیں آتے ہیں گاڑیوں موٹروں اور بسوں کو آدمیوں کی خواہشات قرار دیتے ہیں۔ احمد جاوید آدمیوں کے اس رویے پر بھی طنز کرتے ہیں جس پر وہ کسی دکھ کا اظہار نہیں کرتے تب وہ سوچتے ہیں کہ کیا میں آدمیوں کے جنگل میں تو نہیں۔

مجموعی طور پر احمد جاوید کے افسانوں میں رجائیت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے افسانوں میں مشترک عناصر بھی پائے گئے ہیں۔ دونوں پاکستانی ہم عصر افسانہ نگار ہیں لہذا دونوں کو معاشرتی اور سماجی سطح پر ہونے والے حادثات و واقعات نے یکساں متاثر کیا ہے۔ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں اشتراکات وجودی عناصر میں پائے گئے ہیں۔ مظہر الاسلام کے افسانوں میں کرب، لایعنیت، موت، خوف، گھٹن خود غرضی جیسے عناصر موجود ہیں اسی طرح احمد جاوید کے ہاں بھی وجود کرب، لایعنیت، منافقت اور خوشامد جیسے عناصر موجود ہیں دونوں افسانہ نگار وجود کو ایک قید تصور کرتے ہیں اور اس میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں علاوہ ازیں اجتماعی بے حسی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ احمد جاوید کے ہاں بھی اجتماعی احساس موجود ہے وہ شہر کے گم شدہ ہونے کی شکایت، آوازوں کے گم ہونے پر احتجاج، پولیس کے ناجائز الزامات کو اجتماعی سطح پر زیر بحث لاتے ہیں۔

مظہر الاسلام بھی معاشرے میں ہونے والی ناانصافیوں کو اجتماعی پیمانے پر پرکھتے ہیں دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں احتجاج ملتا ہے ملکی صورت حال کے باعث پھیلے خوف و ہراس پر، آزادی رائے پر پابندیوں کے خلاف اور لوگوں کی بے حسی پر احتجاج ملتا ہے۔ حکومت کی طرف سے عائد کردہ سختیوں کو دونوں شدت سے محسوس کرتے ہیں اور علامتی انداز میں اس پر احتجاج بھی کرتے ہیں طاقت کے زور پر دونوں کے ہاں یکساں احتجاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ علامتوں کے استعمال میں اشتراک نظر آتا ہے۔

وحشی صفت انسانوں کے لئے بھیڑے کی علامت اور چالاک اور مکار لوگوں کے لئے کوئے کی علامت اس کے علاوہ چڑیا سانپ وغیرہ کو یکساں علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ موت کا عنصر بھی دونوں کے ہاں ملتا ہے لیکن احمد جاوید کے ہاتھ اس کی طرف زیادہ رجحان ان نہیں ملتا وہ پر امید رہنے اور وقت کے بدلنے کا پیغام دیتے ہیں۔ مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے افسانوں میں افتراق بھی پایا گیا ہے جو وجودی عناصر کی پیشکش میں فرق نظر آتا ہے۔ مظہر اسلام نے تنہائی، اداسی اور مایوسی کے عناصر کو زیادہ جگہ دی اس کے برعکس احمد جاوید کے ہاں تنہائی اور اداسی کا عنصر کم دیکھنے کو ملتا ہے وہ پر عظم اور یقین محکم کے حامل افسانہ نگار ہیں۔ مظہر الاسلام کے افسانوں میں قنوطی عناصر کی کار فرمائی زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے جب کے احمد جاوید رجائیت پسند ہیں۔

مظہر الاسلام مغربی وجودی مفکر کافکا سے متاثر نظر آتے ہیں جس کا ذکر ان کے افسانوں میں ملتا ہے اور اس کا احترام کرتے ہیں احمد جاوید کے ہاں مشرقی وجودی عناصر کی زیادہ کار فرمائی نظر آتی ہے وہ داخلیت پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ افتراقات میں دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں وجودی عناصر کو پیش کرنے کا انداز بھی مختلف پایا گیا ہے اس کے علاوہ اوہ احمد جاوید کے ہاں سائنسی ترقی پر طنز کا عنصر بھی ملتا ہے وہ صنعتی ترقی کو بھی موضوع بناتے ہیں جو کہ وجودیت کا حصہ ہیں۔ احمد جاوید صنعتی ترقی کے باعث آدمیوں کو محض ایک چلتا پھرتا درخت سمجھتے ہیں مظہر الاسلام کے ہاں خودکشی کے موضوع کو بہت اہمیت حاصل ہے تقریبا ہر کہانی کا انجام یا آغاز خودکشی کے ذریعے ہوتا ہے دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں وجودی عناصر کی کار فرمائی دیکھنے کو ملتی ہے مظہر الاسلام کے ہاں یاسیت کی فضا چھائی رہتی ہے۔

## تحقیقی نتائج

اس تحقیقی مقالے کے ذریعے درج ذیل تحقیقی نتائج سامنے آئے ہیں

ا۔ وجودیت کی تحریک اردو ادب میں ۶۰ء کی دہائی میں ظہور پذیر ہوئی۔ دیگر مغربی تحریکوں کی طرح اس کا تعلق بھی مغرب سے ہے مغرب میں اس کے دو گروہ ہیں مذہبی اور غیر مذہبی دونوں گروہوں کے درمیان مشترک عناصر فرد کی انفرادیت کا ہے تمام وجودی مفکر اس نکتے پر متفق نظر آتے ہیں اور فرد کی انفرادیت پر زور دیتے ہیں ان کے خیال میں معاشرہ یا اجتماع انسان کی ذاتی صلاحیتوں کو مسخ کر دیتا ہے فرد کی آزادی پر بھی متفق نظر آتے ہیں انسان اس دنیا میں آزاد ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وجودیت داخلیت ہے۔ وجودی

عناصر کرب ،لایعنیت ، بیگانگی خود غرضی، مایوسی و اداسی، خوف،وحشت اور موت کا ذکر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

۲۔ مغرب میں اس کے دو گروہ ہیں دینی اور لادینی۔ دینی مفکرین خدا کے تصور کے قائل ہیں جبکہ لادینی اس سے انکار کرتے ہیں مذہبی وجودی مفکرین فرد کے مسائل کا حل داخل کو گردانتے ہیں جبکہ غیر مذہبی مفکرین انسانی فطرت سے انکار کرتے ہیں اور خدا سے منکر ہیں ان کا خیال ہے کہ انسان وہی کچھ ہے جو کچھ خود بنتا ہے اس کی فطرت پہلے سے تعین کردہ نہیں ہوتی ہے

۳۔ مغربی وجودیت مایوسی اور اداسی کو لازم قرار دیتی ہے اس میں امید یا خواہشات کا کوئی عمل دخل نہیں ہے اس کے برعکس مشرق میں وجودی افکار میں کچھ ردوبدل کر کے اسے قبول کیا گیا۔ خدا سے انکار کو مشرق میں نہیں مانا گیا مایوسی اور اداسی جیسے عناصر کو بھی پذیرائی نہ مل سکی یہاں سے مغربی اور مشرقی وجودیت میں فرق نظر آتا ہے۔ مشرق میں داخلیت کو پہلے سے اہم جانا جاتا تھا مشرق میں انسانی فطرت سے بھی انکار نہیں ملتا اسی طرح مایوسی اور اداسی کے بجائے امید کا عنصر مشرقی وجودیت میں ملتا ہے اس نے زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کیا اردو ادب بھی وجودیت کے اثرات سے نہ بچ سکا اردو ادب میں بھی وجودی عناصر کی کارفرمائی دیکھنے کو ملتی ہے۔

۴۔ ساٹھ کی دہائی میں افسانے میں نئے موضوعات کا آغاز ہوا اس سے قبل سیاسی و سماجی سطح پر رونما ہونے والے واقعات ادیبوں کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے لیکن اب ادب میں خارجی موضوعات کے ساتھ ساتھ داخلی کیفیات کو بھی جگہ دی جانے لگی اردو افسانے میں بھی اس رجحان کو فروغ ملا افسانے میں علامتی انداز میں خارجی حالات کے باعث پیدا کردہ فرد کی داخلی واردات کو موضوع بنایا جانے لگا۔

۵۔ مظہر الاسلام کے افسانوں میں رجائی وجودی عناصر موجود ہیں۔ جن میں خود آگہی، خود شناسی، اجتماعی احساس اور آزادی جیسے عناصر شامل ہیں۔ افسانہ می رقصم اور کہانی سے باہر گرا ہوا بابا خود آگہی کی مثال ہیں۔ جن میں مظہر الاسلام تنہائی کی راہ کا انتخاب کر کے اپنی ذات کی تلاش میں مگن ہیں۔ سانپ گھر میں اجتماعی احساس ہے۔ مظہر الاسلام نے معاشرے میں پھیلے انسان دشمنی جیسے زہر کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے اس کے علاوہ معاشرے میں پھیلی ریاکاری جہالت اور خوشامد پر طنز کرتے ہیں۔ زمین کا اغوا اور روئی کے بادبان میں حصول آزادی کی کاوش اور وطن سے محبت دیکھنے کو ملتی ہے۔

۶۔ مظہر الاسلام کے افسانے میں قنوطی عناصر بھی موجود ہیں۔ تنہائی، مایوسی و اداسی جیسے عنصر بکثرت موجود ہیں۔ افسانہ پنجرہ اور پاگل وجودی کرب کی مثالیں ہیں۔ ان افسانوں کے کردار اپنی زندگی کو قید تصور کرتے ہیں جس کے باعث وہ گھٹن کا شکار ہوتے ہیں۔ خودکشی کا موضوع مظہر الاسلام کا پسندیدہ ترین موضوع ہے زیادہ تر افسانوں میں خودکشی کا ذکر ملتا ہے مظہر الاسلام نے دکھ درد کے مارے لوگوں کی کہانیوں کو تحریر کیا۔ وہ مغربی وجودی مفکر کافکا سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ قنوطی عناصر کی پیشکش میں مغربی وجودیت کے زیادہ قریب تر دکھائی دیتے ہیں۔

۷۔ احمد جاوید نے افسانہ نگاری کا آغاز ساٹھ کی دہائی میں کیا لیکن واضح پہچان ستر کی دہائی ہے علامتی انداز میں وجودی عناصر کی پیشکش دیکھنے کو ملتی ہے۔ احمد جاوید کے افسانوں میں بھی رجائی اور قنوطی عناصر موجود ہیں لیکن رجائی عناصر کی پیشکش میں تسلسل دیکھنے کو ملتا ہے۔ رجائی عناصر میں خود آگہی افسانہ میں کون ہوں میں موجود ہے۔ داخلیت کا عنصر احمد جاوید کے ہاں تسلسل کے ساتھ دیکھنے کو ملتا ہے اسی طرح امید کا عنصر احمد جاوید کے ہاں غالب نظر آتا ہے آسیب زدہ رات اور افسانہ آثار اس کی مثالیں ہیں۔

۸۔ قنوطی عناصر میں وجود کا کرب اور زندگی کی مہملیت دیکھنے کو ملتی ہے افسانہ بھیڑیا اور جنگل، جانور، آدمی میں انسان اپنے وجود کے کرب میں مبتلا ہے۔ زیادہ تر افسانوں میں گھٹن زدہ فضا کے عث وحشت پھیلی ہے اور کرفیو کی وجہ ملکی فضا پر خوف طاری ہے۔ آسیب زدہ رات افسانے میں پوری فضا پر خوف طاری ہے احمد جاوید کے ہاں تسلسل سے خوف اور گھٹن کا ذکر ملتا ہے اکثر افسانوں کے کردار حبس کے موسم کے باعث گھٹن محسوس کرتے ہیں اور سانس لینے میں دشواری محسوس کرتے ہیں وجود کا کرب اور زندگی کی لایعنیت موجود ہے۔ احمد جاوید دنیا کو ایک پنجرہ تصور کرتے ہیں زندگی کی الجھنوں سے وحشت محسوس کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

۹۔ مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے افسانوں میں وجودی عناصر کی پیشکش میں مماثلت پائی گئی ہے مظہر الا اسلام اور احمد جاوید کے افسانوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں وجودی عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دونوں افسانہ نگاروں نے فرد کی داخلی کیفیات اور اس کے باعث پیدا ہونے والی نفسیاتی کشمکش پر لکھا ہے قنوطی عناصر میں کرب، مغائرت، مایوسی و، اداسی، تنہائی اور موت وغیرہ کی پیشکش میں یکسانیت پائی گئی ہے اور رجائی وجودی عناصر میں فرق دیکھنے کو ملا ہے مظہر الاسلام کے افسانے میں رجائی

عناصر موجود ضرور ہیں لیکن ان عناصر میں تسلسل موجود نہیں ہے جیسا کہ احمد جاوید کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

۱۰۔ مظہر الاسلام کے ہاں قنوطی رویہ غالب ہے ان کے کردار مایوسی، تنہائی اور اداسی کا شکار ہیں ان ہی کیفیات کی وجہ سے وہ موت کو گلے لگا لیتے ہیں خود کشی کا رجحان مظہر الاسلام کے افسانے میں زیادہ نظر آتا ہے جبکہ احمد جاوید کے ہاں امید کا عنصر غالب ہے وہ اس گھٹن زدہ ماحول کے ختم ہونے اور اچھا وقت آنے کی نوید سناتے ہیں۔ اگرچہ ان کے کردار مسائل کا شکار ہیں لیکن مایوسی یا اداسی کے بجائے امید کی ڈور سے بندھے رہتے ہیں خود شناسی کا عنصر دونوں کے ہاں موجود ہے لیکن احمد جاوید کے ہاں اس کی پیشکش زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے مظہر الاسلام مغربی مفکر کافکا سے متاثر ہیں اس کے علاوہ امریتا پریتم اور امریکی شاعرہ سلویا پلاتھ سے بھی متاثر نظر آتے ہیں مظہر الاسلام نے مغربی وجودیت سے زیادہ اثر قبول کیا ہے یکسر مغربی وجودیت تو نہیں کہا جا سکتا لیکن قنوطی عناصر کی پیشکش کی بنا پر مغربی وجودیت کے زیادہ قریب تر معلوم ہوتے ہیں جب کہ احمد جاوید کے ہاں مغربی وجودی عناصر بھی موجود ہیں لیکن مشرقی وجودیت کے اثرات زیادہ نظر آتے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں افسانہ نگاروں کے ہاں مغربی اور مشرقی وجودی عناصر موجود ہیں۔

## سفارشات

مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے افسانوں کا سیاسی اور سماجی صورت حال کے تناظر میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے
مظہر الاسلام کے افسانوں کو علامتی حوالے سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے
مظہر الاسلام اور احمد جاوید کے افسانوں میں موجودہ علامتوں کا تقابل کیا جا سکتا ہے

# کتابیات

## بنیادی مآخذ


احمد جاوید، غیر علامتی کہانی (افسانوی مجموعہ)، سیپ، خالدین، لاہور، ۱۹۸۳ء

احمد جاوید، چڑیا گھر (افسانوی مجموعہ)، سیپ، گندھارا بکس، روالپنڈی، ۱۹۹۶ء

احمد جاوید، گمشدہ شہر کی داستان (افسانوی مجموعہ)، سیپ، گندھارا بکس، روالپنڈی، ۲۰۰۲ء

مظہر الاسلام، گھوڑوں کے شہر میں اکیلا آدمی (افسانوی مجموعہ)، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۲ء

مظہر الاسلام، باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی (افسانوی مجموعہ)، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء

مظہر الاسلام، خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر (افسانوی مجموعہ) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء


## ثانوی مآخذ


اختر وحید، آگ کا دریا اور وجودیت، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۲ء

انیس ناگی، میری ادبی بیاض، جمالیات، لاہور، ۱۹۹۶ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تنقید اور تجزیہ، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۸ء

جمیل اختر محبی، ڈاکٹر، فلسفہ وجودیت اور جدید اردو افسانہ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۲ء

حسن عسکری، جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ، عصمت میشن، روالپنڈی، ۱۹۷۹ء

سی۔اے قادر ڈاکٹر، وجودیت، مشمولہ: فلسفہ جدید اور اس کے دبستان، اردو، اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۱ء

سلطان علی شیدا، وجودیت پر ایک تنقیدی نظر، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء

شمیم حنفی، جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، قومی کونسل برائے فروغِ اردو حکومت ہند، نئی دہلی ۲۰۰۵ء

علی عباس جلالپوری، روایات فلسفہ، منظور پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۶۹ء

غفور شاہ قاسم، پاکستانی ادب، (۱۹۴۷ء سے تاحال)، بک ٹاک، لاہور، ۱۹۹۵ء

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۲ء

مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر، افسانہ کا منظر نامہ، اورینٹ پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۲ء

محمد حسن، ڈاکٹر، ادبی تنقید، ادارہ فروغ اردو زبان، لکھنو، ۱۹۷۳ء

Sartre, Jean-Paul, Existentialism and Humanism, Methuen, Londen , 1948.

## رسائل وجرائد:

حمیرا اشفاق،وجودیت اور اردو ناول، مشمولہ ،معیار ،شمارہ نمبرا، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی،اسلام آباد جنوری تاجون۲۰۰۹ء

ریاض احمد،وجودیت کیاہے، مشمولہ،ادبی دنیا،شمارہ پنجم،لاہور،س ن

ممتاز احمد،وجودیت منظر وپس منظر، مشمولہ(فنون)،لاہور۱۹۹۶ء